وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ——— لاہور

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :
709, 7TH FLOOR, QAMAR HOUSE,
M.A. JINNAH ROAD, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880731

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | نومبر ۱۹۸۴ء - مطابق صفر المظفر ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱۱

مشمولات

● عرضِ احوال ———— ۳

——جمیل الرحمٰن

● تذکرہ و تبصرہ ———— ۷

و ہمارے معاشرے کی اصل کمزوری

و قصاص و دیت کا مسودہ قانون

و مسئلہ رجم اور دین میں عقل و نقل کا صحیح مقام

——ڈاکٹر اسرار احمد

● [مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کا ایک استفسار —— اور امیر تنظیم اسلامی کی طرف سے اس کا جواب] ۵۱

● افکار و آراء ———— ۶۹

[ڈاکٹر اسرار احمد کی گزشتہ تقریر پر علماء کرام کے تبصرے اور آراء]

● رفتارِ کار ———— ۸۵

——ادارہ

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی

فون: ۸۵۷۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

بسم الله الرحمن الرحيم

سانيو
SANYO

AIRCONDITIONERS REFRIGERATORS & FREEZERS

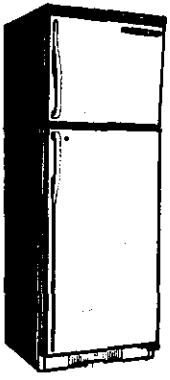

NO-FROST REFRIGERATORS
with exclusive features

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature.
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.

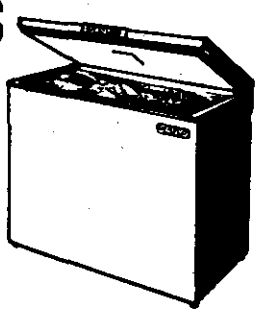

CHEST/UPRIGHT FREEZERS

AIR-CONDITIONERS
new in utility
with higher efficiency

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.

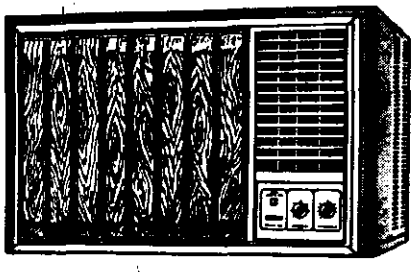

Available at all SANYO Authorised Dealers

MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN

SPECIAL ATTENTION: Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's 5 year Guarantee Certificate in order to avail free after Sales Service.

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI. PHONES: (PABX) 525151-55 (5 Lines)
CABLE: "WORLDBEST" TELEX: 2510 WWTCO PK

786/WW-109/83

شیخ جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ "میثاق" بابت صفر المظفر ۱۴۰۵ھ مطابق نومبر ۱۹۸۴ء پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی دو اہم چیزیں شامل ہیں۔ پہلی چیز ڈاکٹر صاحب موصوف کا وہ خطاب ہے جو موصوف نے ۲۴ اگست ۸۴ء کو صلوٰۃ جمعہ سے قبل مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمایا تھا ــــ جس میں جہاں ملکی موجودہ حالات پر بلاواسطہ تبصرہ تھا اور اس امر کی نشاندہی بھی کہ بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے جذبۂ صادق ہی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے شریعت کے واضح نصوص پر بحث ومناقشہ کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہاں اصل موضوع قصاص ودیت کے مسوّدہ قانون کے متعلق ان اعتراضات کا جواب تھا جو ملک میں "روشن خیال" طبقے خاص طور پر اس طبقے کی خواتین کی طرف سے اٹھایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہایت سادہ لیکن مدلل انداز سے اس مسئلے کو واضح فرمایا۔ ساتھ ہی اس فرق کی حکمت بھی بیان کر دی ہے جو قتلِ خطاء کی صورت میں مرد وعورت کی دیت کے مابین شریعت نے رکھا ہے۔ جو لوگ بھی شریعت پر عمل کرنے کے ارادے سے معروضی طور پر ان امور پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ ان پر شریعت کا حکم اور اس کی حکمت مبرہن ہو جائے گی۔ یہ خطاب بھی کیسٹ سے منتقل کیا گیا ہے ـــــ

دوسری چیز جناب اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب جو باب العلوم، کہروڑ پکا، ملتان سے متعلق ہیں، کے دو خطوط اور ایک استفسار شائع شدہ معاصر "الخیر" ملتان بابت جولائی ۸۴ء اور ان سب کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے قلم سے تحریر کردہ جواب شامل ہے۔ جواب کا اصل مفاد یہ ہے کہ علماء کرام خاص طور پر ان علماء عظام کی غلط فہمیاں رفع کی جائیں جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے ارادت وعقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ان کو دعوت دی جائے کہ وہ اس کام کی تجدید کی طرف اپنی توجہات کو مرتکز فرمائیں جس کے لئے شیخ الہندؒ اپنی عمر کے آخری حصّے میں نہایت مضطرب اور عملی جدوجہد کے لئے کوشاں تھے ـــ آج اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ جس طرح ایک طرف "اسلام آ رہا ہے" کی گردان ہے اور دوسری طرف منکرات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور شریعت حقّہ کے ان احکام وشعائر کو بحث وتمحیص اور اعتراض نیز مخالفت کا ہدف

بنایا جارہا ہے جن پر چودہ صدیوں سے امّت کا اجماع رہا ہے، علماء کرام کا دینی فرض ہے کہ وہ دینِ حنیف کی مدافعت کے لئے بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہوں اور ان فتنوں کے سدِّباب کے لئے اپنی توانائیاں لگادیں اور اس سلطنتِ خداداد پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے اپنی ذمہ داری ادا فرمائیں۔ اسی میں اس ملک کے لئے بھی خیر ہے اور اسی میں اس کام کے لئے سعی و محنت کرنے والوں کے لئے اخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

ستمبر کے "میثاق" میں محترم ڈاکٹر صاحب کا وہ مکمّل خطاب شائع کیا گیا تھا جو موصوف نے ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۰ جون ۱۹۸۲ء کو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس خطاب پر ادارہ "میثاق" کی جانب سے متعدد علماء کو تبصرہ کی دعوت دی گئی تھی۔ اس ضمن میں جو تبصرے ادارے کو تادمِ تحریر موصول ہوئے ہیں وہ بلا تبصرہ اور بلا ترمیم اس شمارے میں "افکار و آراء" کے مستقل عنوان کے تحت شائع کئے جارہے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ان تبصروں میں جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے، ان سے ادارے کو صد فی صد اتفاق ہو۔ تمام تبصرہ نگار حضرات نے خلوص و اخلاص کے ساتھ اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ میثاق کے قارئینِ کرام کے سامنے یہ بات آجائے کہ ہمارے اصحابِ علم و فضل نے امیرِ محترم کے خطاب سے کیا اثرات قبول کئے ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ امیرِ محترم کی صحت بہتر ہے۔ بحمد اللہ ان کو ۲۶ ستمبر ہی سے کافی افاقہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر کے جمعہ سے امیرِ محترم کی دعوتی سرگرمیاں مسجد دارالسلام کے خطابِ جمعہ سے شروع ہوگئی ہیں اور معمولات کے مطابق بیرونِ لاہور بھی دعوتی دوروں کی تجدید بھی ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امیرِ محترم کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے تاکہ جو مہلتِ عمران کے لئے اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں مقرر ہے اس کا ہر لمحہ خدمتِ دین میں صرف ہو۔

کچھ عرصہ قبل کراچی کے بعض احباب کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ خیال ڈالا کہ پاکستان ٹی وی پر محترم ڈاکٹر صاحب کا تعلیماتِ قرآنی پر مبنی جو ہفتہ وار پروگرام "الھدیٰ" کے ٹائٹل کے تحت جاری تھا جس میں موصوف منتخب نصاب کا درس دے رہے تھے جو ابھی نصف تک پہنچا تھا کہ اسے ٹی وی کے اربابِ اختیار کی جانب سے بند کر دیا گیا اور جس کی بندش پر قریباً دو سال

بیت گئے اور بظاہر احوال اس کی تجدید کی صورت نظر نہیں آتی تو کیوں نہ کراچی میں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی شایانِ شان مقام پر "الہدیٰ" کے تسلسل کو جاری رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ـــــ خلوص و اخلاص سے جو کام کیا جاتا ہے اللہ کی یہ سنّت ہے کہ وہ اسے کامیاب فرماتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے خاص اپنے فضل سے اس کوشش کو کامیاب فرمایا۔ کراچی کے اعلیٰ ترین ہوٹل "تاج محل" کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب منصور فیروز الدین بوبچہ صاحب نے اس مقصد کے لئے اپنے ہوٹل کے "موتی محل آڈیٹوریم" کی پیش کش فرما دی۔ نیز چند احباب نے مل جل کر اس پروگرام کے انعقاد کے اخراجات پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ چنانچہ ۲۹ر اکتوبر بروز سوموار بعد نماز مغرب ان شاء اللہ "شاہدِ الہدیٰ" کے نام سے اس کا آغاز ہو جائے گا اس کا انتظام "بزمِ احبابِ الہدیٰ کراچی" کرے گی۔ جس کی کنوینر شپ کیپٹن (ریٹائرڈ) کریم صدیقی صاحب نے قبول فرمائی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ انگریزی ماہ کے ہر آخری سوموار کو بعد نمازِ مغرب اسی مقام پر یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جن حضرات نے خالصتہً لوجہ اللہ اس کارِ خیر میں تعاون فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ان کو اس کا اجر و ثواب عطا کرنے والا ہے۔

ادارہ میثاق کو بعض ناشران کی جانب سے کتب برائے تبصرہ ارسال کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک تو کوئی ایسے صاحب میسّر نہیں تھے جو ان کتب کے مطالعہ کے لئے وقت نکال کر تبصرہ کر سکتے دوسرے میثاق کے صفحات میں اس کی گنجائش پیدا کرنا بھی نہایت دشوار نظر آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جناب محمد رفیق چودھری صاحب ادارۂ حکمتِ قرآن سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب صاحبِ علم و فضل ہیں اور اس کام کے اہل ہیں۔ چنانچہ موصوف نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے کہ وہ آمدہ کتب پر مستقل طور پر تبصرہ کیا کریں گے جو ان شاء اللہ حکمت قرآن میں شائع ہوا کرے گا۔ اس کا آغاز ماہ نومبر ۸۴ء کے شمارے سے ہو جائے گا۔ لہٰذا جو ناشر حضرات اپنی کتابوں پر تبصرہ چاہتے ہوں ان سے گذارش ہے کہ وہ آئندہ کتابیں ماہنامہ حکمتِ قرآن ۳۶کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ کے نام ارسال فرمایا کریں۔

مضامین کی کثرت اور صفحات کی قلت کے باعث سلسلہ وار مضمون "الہدیٰ" اس شمارے میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ اس سلسلے کی بیسویں قسط شائع ہو گی۔ جس سے سورۃ تغابن کے درس کا آغاز ہو گا

بیدِ اللہِ التوفیق وعلیہ التکلان

الھدیٰ

کیسٹ سیریز

ڈاکٹر اسرار احمد (امیر تنظیم اسلامی)

کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل

نشر القرآن

کیسٹ سیریز

تنظیم اسلامی

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

Adarts CAR-2/84

تذکرہ و تبصرہ

—— ہمارے معاشرے کی اصل کمزوری
—— قصاص و دیت کا مسودۂ قانون
—— مسئلہ رجم —— اور دین میں عقل و نقل کا صحیح مقام

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کا مندرجہ بالا موضوعات پر جمعۃ المبارک ۲۴ اگست ۸۴ء کا خطاب قدرے حک و اضافہ کے ساتھ استفادۂ عام کیلئے پیش ہے (ادارہ)

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصاً علٰی افضلہم سید المرسلین خاتم النبیین محمد الامین وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین —— امّا بعد

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَۃً وَّجِلَتْ مِنْہَا الْقُلُوْبُ وَ ذَرَفَتْ مِنْہَا الْعُیُوْنُ ، فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَاَنَّہَا مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا قَالَ اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ فَاِنَّہٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَہْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْہَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ ۔ امّا بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ

یفقھوا قولی۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ۔ اللھم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم۔

حضرات! گذشتہ جمعہ میں، مَیں نے اپنے ان بعض مشاہدات کا ذکر کیا تھا جو ایک طویل سفر سے واپسی پر مجھے وطنِ عزیز میں ہوئے تھے اور ان کے بارے میں اپنے تأثرات اور اپنے احساسات قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے رکھے تھے[لہ]۔ انہی میں ایک مسئلہ قصاص و دیت کے مسوّدہ قانون سے متعلق ہے جس کے بارے میں ایک CONTROVERSY ہمارے ملک میں عرصہ دراز سے چل رہی تھی — واپسی پر معلوم ہوا کہ اس دوران اس CONTROVERSY — اس مناقشہ میں بہت شدّت پیدا ہوئی۔ ایک خاص نقطۂ نظر کے حق میں خواتین کی بعض تنظیموں کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالے گئے اور جلسے کئے گئے۔ اخبارات میں کثرت سے مضامین، بیانات اور مراسلات شائع ہوئے۔ جواباً دوسرے نقطۂ نظر کی جانب سے بھی جلسے ہوئے اور اخبارات اور خاص طور پر دینی رسائل میں اپنی رائے کا اسلامی نقطۂ نظر سے مدلّل اظہار رائے کیا گیا۔ اس سے پہلے قانونِ شہادت کی ایک شق کے بارے میں بحث و تمحیص اور مخالفانہ آرا کا ہمارے ملک میں ہمارے معاشرے میں "روشن خیال" خواتین کی طرف سے اخباری بیانات، مراسلات، مضامین کے اظہار اور احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اس کے ضمن میں بہت سے احباب کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہوگا۔ اور بعض حضرات نے مختلف مواقع پر مجھ سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا۔ وہ استفسار یہ تھا کہ میں ان موضوعات و معاملات میں کیوں خاموش رہا ہوں اور میں نے ان مسائل پر اپنی کسی تفصیلی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا! حالاں کہ ایک خاص اعتبار سے لوگوں کو توقع تھی کہ شاید ان معاملات میں سب سے زیادہ شدّومدّ کے ساتھ میری طرف سے اظہارِ خیال ہوگا۔ چوں کہ ایسے معاملات میں نقطۂ نظر کا جو بنیادی اختلاف کارفرما ہے وہ مردوں اور عورتوں کے

لہ یہ مکمل تقریر میثاق اکتوبر ۸۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

مابین کامل مساوات کا نظریہ ہے جو مغرب کی جدید فکر، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے رگ و پے میں سرائت کئے ہوئے ہے اور اسی نظریے سے مرعوب و مسحور ہمارے معاشرے میں ایک فعال طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ عددی اعتبار سے یقیناً ایک چھوٹی اقلیت ہے، لیکن فعال اقلیت ہے۔ وہ مساوات مرد و زن کے نظریے پر پورا ایمان رکھتی ہے اور وہی اقلیت ہے جو ایسے تمام مسائل میں جہاں ان کے نظریے کے مطابق عورت کا درجہ کسی نوعیت سے مرد کی برابری کا نہ ہو، سراپا احتجاج بن جاتی ہے پھر اسی اقلیت کے زیادہ تر افراد چونکہ یا تو حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہیں یا بڑی بڑی صنعتوں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس طبقے کے احتجاج، خاص طور پر اس کی خواتین کے احتجاج، مخالفانہ بیانات، مراسلات اور مضامین کو ہمارے ذرائع ابلاغ بڑی نمایاں حیثیت سے COVERAGE دیتے ہیں۔ ان کی تشہیر کرتے ہیں چنانچہ ایسے موضوعات معاشرے میں ایک شدید ردّ و قدح اور بحث و مباحثے کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ یہ مساواتِ مرد و زن کا جو اصل مسئلہ ہے، اصل CONTROVERSY ہے جو اصل بنیاد ہے اس کے ضمن میں آج سے قریباً دو سال قبل جو سب سے بڑی CONTROVERSY زور شور سے اٹھی تھی وہ میرے ہی حوالے سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی ستر و حجاب اور عورت کے جداگانہ دائرہ کار کا مسئلہ۔ اگرچہ وہ مسئلہ میں نے اپنے کسی شعوری ارادے سے، اپنے کسی فیصلے سے یا اپنی کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شروع نہیں کیا تھا بلکہ ایک نیم دوستانہ اور ایک نیم صحافیانہ گفتگو تھی جس کی رپورٹنگ ہوئی اور اس کے حوالے سے اس وقت ہمارے ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ تاہم جب یہ مسئلہ چھڑ گیا اور سوال اُٹھ کھڑا ہوا تو اس مسئلہ پر میں اسلام کا جو نقطہ نظر سمجھتا ہوں اور ہمارے دین کی جو تعلیمات ہیں، میں نے اُن کو بھرپور انداز اور پوری قوت کے ساتھ پیش کیا تھا[1] چنانچہ مساواتِ مرد و زن کے مسئلے

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب کا اس موضوع پر مبسوط و مدلل خطاب "اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے (مرتب)

کے بارے میں CONTRO-VERCY کا وہ جو دور تھا اس میں "روشن خیال" طبقے کے نزدیک نمایاں ترین اور متنازعہ ترین شخص میں بن گیا تھا۔

لیکن جب اُسی مساواتِ مرد و زن کے مسئلہ کا ان دو اعتبارات سے یعنی قانونِ شہادت کی ایک شق اور مسودہ قانونِ قصاص و دیت کے حوالے سے مزید ظہور ہوا تو اس پر میں خاموش رہا۔ یقیناً یہ ایک سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا ہو گا اور بعض حضرات نے، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اس کے بارے میں مجھ سے باضابطہ استفسار بھی کیا ــــ میری اس خاموشی کا جو سبب ہے پہلے میں اُسے بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ پھر قصاص و دیت کے مسئلہ پر اپنی رائے پیش کر دوں گا جو ان شاء اللہ کتاب و سنت پر مبنی ہو گی۔ اصل سبب یہ ہے کہ میری تشخیص یہ ہے کہ ہمارے اس معاشرے میں ــــ جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ہیں، جن کا ایک اجمالی ذکر میں آگے چل کر آج کی گفتگو میں کروں گا انشاء اللہ، میری تشخیص یہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا داعیہ اور ارادہ مضمحل ہو چکا ہے ــــ اصل شے یہ ہے کہ کسی فرد میں، کسی قوم میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اُسے مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے ــ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو اب خود اُس کی طرف سے یہ بات ایک بالکل معروضی انداز میں پوچھی جائے گی، تلاش کی جائے گی کہ اسلام کیا کہتا ہے! میں مسلمان رہنا چاہتا ہوں، مسلمان مرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کیا ہے! اللہ کا حکم کیا ہے! اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا ہے! ہمارے ائمہ عظام جنہوں نے اسلام کو سمجھنے میں اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا دی ہیں، انہوں نے فلاں مسئلہ میں کیا رائے ظاہر کی ہے! اس وقت ایسے شخص کا رویہ ہو گا اتباع کا ــــ اس کے اندر ایک جذبہ ہو گا اطاعت کا ــــ ایسا شخص کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کرے گا تو اس لیے کہ اس کے اپنے اندر ایک داعیہ پیدا ہو چکا ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے! تاکہ وہ اس پر چلے ــ اُسے معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کیا ہے! تاکہ وہ اسکے مطابق اپنی زندگی کا رُخ تبدیل کرے ــ اُسے معلوم ہو کہ اہل علم کا کیا کہنا ہے! تاکہ وہ اس کے مطابق عمل کرے ــــ یہ رویہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر یہ ارادہ وجود میں آ چکا ہو ــ لیکن اگر یہ ارادہ موجود نہ ہو تو مختلف مسائل کے

بارے میں یہ ساری بحثیں کہ قرآن کیا کہتا ہے، رسول کی سنت کیا ہے! امام ابوحنیفہ کا قول کیا ہے! امام شافعی کی رائے کیا ہے! اور امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا موقف کیا ہے! خلفائے اربعہ رضؓ کا تعامل کیا ہے! تابعین و تبع تابعین کا مسلک کیا ہے! محض علمی بن کر رہ جاتی ہیں — یہ علمی CONTROVERSY ہے جس کی عملی اعتبار سے کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر میری یہ تشخیص اور میری یہ رائے صحیح ہو کہ ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا جذبہ اور داعیہ مضمحل ہے، وہ ارادہ ہی موجود نہیں ہے — اشخاص کے اندر بھی شاذ ہی ایسے افراد ہمارے معاشرے میں ملیں گے۔ جن میں یہ ارادہ قوی ہے اور مضبوط ہے لیکن جب ہم معاشرے کو ایک اکائی کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتبار سے وہ ارادہ — جسے میں "COLLECTIVE WILL" کا نام دیتا ہوں — اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبانی کلامی اسلام کی مدح سرائی کے سوا عملی اعتبار سے اسلام کے حق میں وہ اجتماعی ارادہ، وہ "COLLECTIVE WILL" کہ ہمیں مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے، موجود نہیں ہے، — لہٰذا اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جو فی الواقع درپیش ہے، موجود ہے، اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اس اجتماعی ارادے کو پیدا کیا جائے۔ "THE WILL TO BE A MUSLIM" — اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ ایک انسان پہلے یہ فیصلہ تو کرے اور اسی طریقے سے ایک معاشرہ — جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو اب شریعت کے تمام احکام کو ذہناً بالکلیہ قبول کرنا اور ان پر عمل کرنے کی پیہم اور مخلصانہ سعی و کوشش کرنا بڑا آسان کام ہو جائے گا — اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور قرآن مجید کے نزول کے اعتبار سے جو حکمتِ دین ہے، اس کا بھی یہ ایک اہم پہلو ہے کہ ابتدا میں احکام نہیں دیئے گئے — شریعت کے احکام اور حلال و حرام کے احکام — کچھ نہیں دیئے گئے۔ بارہ تیرہ برس جو مکہ مکرمہ کے ہیں، ان میں اس ارادے کو تقویت دی گئی۔ اللہ کی توحید پر، رسول کی رسالت پر اور وقوعِ قیامت و آخرت پر ایمان پیدا کیا گیا۔ یقین پیدا کیا گیا — اس ایمان و ایقان کے نتیجے میں ارادہ ابھر کر سامنے آیا اور عمل کا ایک شدید داعیہ اہلِ ایمان کے قلوب میں موجزن ہو گیا۔ گویا کہ ایک STRONGEST COLLECTIVE WILL وجود میں آ گئی —

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد جب اہلِ ایمان کا اپنا ایک معاشرہ وجود میں آگیا تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایمان کے مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کی اس معاشرے میں شدید طلب اور پیاس پیدا ہوگئی۔ ایک URGE پوری قوت سے ابھر آیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مدنی سورتوں میں سب سے پہلی اور سب سے طویل صورت سورۃ البقرہ ہے۔ اس میں کئی جگہ بہت سے احکام کا ذکر اس طرح ملتا ہے "یَسْئَلُوْنَكَ" اے نبی یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں ۔۔۔ جیسے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ "اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں"۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ "اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں!" یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ۔ " اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں ان کے لیے حلال ہیں!"۔ پس معلوم ہوا کہ جب وہ COLLECTIVE WILL پیدا ہوگئی تو خود بخود سوال پیدا ہوئے کہ ہمیں بتایا جائے کہ زندگی کے مختلف معاملات اور مقتضیات میں ہم کیا کریں! کون سا رویّہ اختیار کریں! ۔ یہ داعیہ اتنی شدت سے ابھرا کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے کے بارے میں جستجو، اصرار اور URGE پیدا ہوگیا ۔ تو جب یہ COLLECTIVE WILL پیدا ہوگئی۔ یہ URGE اچھی طرح ابھر آیا تو اس کے بعد احکام دیئے گئے اور جیسے جیسے احکام نازل ہوتے گئے تو معاشرہ گویا پہلے سے تیار تھا اور وہ قبول کرتا چلا گیا اور احکام کی تنفیذ ہوتی چلی گئی ۔ ہم کو اس معاشرے میں یہ بات قطعی نظر نہیں آتی کہ کسی مسئلہ میں کوئی CONTROVERSY پیدا ہوگئی ہو۔ بلکہ سوائے سود کی حرمت کے حکم کے اور کسی حکم کے متعلق ہمیں اس دور میں یہ بات بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی عقلی دلیل بھی طلب کی گئی ہو ۔۔ سود کی حرمت کے حکم پر یہ عقلی اعتراض وارد کیا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں، اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔ بیع میں بھی تو کچھ منفعت ہو جاتی ہے کچھ نفع ہو جاتا ہے ۔ سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دی تو دس بچ گئے تو اگر سو روپے کسی کو قرض دے کر اس سے ایک سو دس لے لیے تو آخر اس میں فرق کیا ہے؟! ۔۔۔

لے اس کے جواب میں کوئی عقلی دلیل دینے کے بجائے فرمایا گیا کہ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط "کہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا ہے"۔ یعنی ایک بندۂ مومن کے لیے تعمیلِ حکم کے واسطے یہ دلیل کافی ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے جس پر تم ایمان لانے کے مدعی ہو۔ (مرتب)

اس کے سوا ہمیں نظر نہیں آتا کہ کچھ CONTROVERSIES اٹھی ہوں اور عقلی استدلالات یا عقلی اشکالات پیش اور وارد کئے گئے ہوں اور بحث و تمحیص کے دروازے کھل گئے ہوں ۔ اس دور میں جس طریقے سے "دانشوروں" اور علماء کے مابین دینی مسائل کے بارے میں بڑی ہی رنگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ رنگا رنگ اختلافی مضامین چھپتے اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں، اس قبیل کی کسی شے کا اس دور میں کوئی سُراغ نہیں ملتا ۔ اس لیے کہ پہلے وہ WILL پیدا کر دی گئی، وہ ارادہ پیدا کر دیا گیا تھا جس کے بعد اب جو بھی احکام دیئے گئے تو "سرِ تسلیم خم ہے" والا رویہ اختیار کیا گیا اور ان کو اس طور سے قبول کیا گیا کہ جیسے وہ پہلے ہی سے منتظر تھے کہ وہ حکم آئے اور وہ قبول کریں اور فوراً اس پر عمل شروع کر دیں ۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کم سے کم اجتماعی سطح پر وہ COLLECTIVE WILL موجود نہیں ہے ۔ ہے بھی تو وہ بہت مضمحل ہے ۔ اس کی وجہ کیا ہے ! اس کو بھی سمجھ لیجئے ۔ اصل میں مغرب و مشرق کا جو تصادم ہے وہ جدید خدا ناآشنا تہذیب اور فکر جو یورپ سے آیا تھا ۔ اس تصادم کی تاریخ ویسے تو قریباً دو سو برس کی تاریخ ہے ۔ جیسے ہی یورپ کے ممالک سے انگریز آئے، فرانسیسی آئے اور ولندیزی آئے لیکن ہوتے ہوتے انگریز کے سوا دوسری اقوام کا عمل دخل ختم ہو گیا یا نہ ہونے کے برابر رہ گیا، صرف انگریز قوم کا برِصغیر پاک و ہند پر پورا تسلط قائم ہو گیا اور پورا ملک براہ راست اس کی سیاسی غلامی میں چلا گیا ۔ جیسے ہی یہ معاملہ ہوا، ویسے ہی تصادم شروع ہو گیا ۔ بالکل نئی تہذیب آئی تھی ۔ مادہ پرستانہ تہذیب ۔ اس تہذیب میں چمک دمک تھی ۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

لیکن یہ تو ایک بالغ نظر شخص ہی دیکھ سکتا تھا کہ یہ جھوٹے نگ ہیں ۔ ہمارے یہاں ایک خاص طبقے نے اس تہذیب پر لبیک کہا اور اسے اختیار کیا ۔ یہ بھی بلا سبب نہیں ہوا ۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حکمران قوم کی تہذیب تھی ۔ یہ ایک محکوم قوم کے افراد تھے ۔ محکوم قوموں میں حاکم قوم سے مرعوبیت ہوتی ہے ۔ لہٰذا ہمارے

ایک طبقے نے اس تہذیب کو، اس کے اصول کو، اس کے مبادی کو، اس کے مظاہر کو، اور اس کے فکر و فلسفہ کو ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا۔ پھر یہ کہ یہ مظہر (PHENOMENON) مشترکہ طور پر آپ کو ہر محکوم قوم میں نظر آئے گا کہ محکوم قوم میں سے جو طبقہ حکمران قوم کی تہذیب کو آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے، اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگنے اور اسی سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتا ہے تو وہ طبقہ حاکم قوم کے قریب ہو جاتا ہے اس سے مفادات حاصل کرتا ہے۔ اس کی حکومت کی مشین میں پرزہ بنتا ہے اس سے وفاداری کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سے خطابات حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت دنیوی ترقی کے لیے یہی راستہ سب سے زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ چوں کہ اس طبقے کے لیے معیشت کے دروازے کشادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ دُور رہیں گے، پیچھے رہیں گے، قریب نہیں آئیں گے وہ معاشی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جائیں گے اور ان کا SOCIAL STATUS بھی کم رہ جائے گا۔

نتیجتہً ہمارے یہاں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے آپ کو بالکلیہ انگریزی تہذیب میں رنگ لیا۔ اور ہمارے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق اس طبقہ کا طرزِ عمل یہ ہو گیا کہ چمڑی کی رنگت کے سوا ہمیں ہر اعتبار سے "انگریز" بن جانا ہے۔ یہ گویا کہ OBJECTIVE تھا جو اس دور میں دیا گیا تھا۔ یہ سرسید احمد خاں کا قول ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں کہ "سوائے چمڑی کی رنگت کے"۔ اس لیے کہ وہ تو اختیار سے باہر کی شے ہے اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔ "مسلمانوں کو چاہیے کہ انگریز بن جائیں اور انگریزی تہذیب اختیار کر لیں[1]"۔ تو یہ ایک طبقہ تھا جو اگرچہ ایک محدود طبقہ تھا۔ بالکل اقلیت میں تھا، تعداد کے اعتبار سے بہت قلیل تھا۔ لیکن چوں کہ حکمران طاقت کے قریب تر یہی طبقہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا اس کا نفوذ اور اثر ہمارے معاشرے میں مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ تو یہ تصادم ہمارے یہاں اس وقت سے شروع ہو چکا تھا۔

لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ ایک خاص بات آپ نوٹ کر لیں۔ وہ یہ کہ ہمارے معاشرے پر مغربی تہذیب کا بحیثیتِ مجموعی عمل دخل انگریز کی براہِ راست سیاسی غلامی کے

---

[1] سرسید احمد خاں کی جو تصاویر ملتی ہیں اس میں ترکی ٹوپی کے سوا وہ پورے کے پورے انگریزی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں (مرتب)

دور میں اتنا نہیں ہوا، جتنا کہ آزادی کے بعد ہوا ہے۔ یہ جو سینتیس ۳۷ برس ہم نے آزادی کے بتائے ہیں، ان میں یہ عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ بہت وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اسوقت صورتحال یہ تھی کہ وہ جو ایک محدود طبقہ تھا اور اس کا انگریزی حکومت سے بڑا قریبی تعلق تھا لہٰذا ہمارے عوام ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عوام الناس کو اس طبقے سے عموماً نفرت تھی[1]۔ دوسرے یہ کہ محکوم قوم کے جذبات حکمران قوم کے لیے خیرسگالی اور پسندیدگی کے نہیں ہوا کرتے۔ مزید برآں عالم اسلام کو انگریزی حکومت کی وجہ سے جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے بھی بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے اندر انگریز اور انگریزی تہذیب سے واضح نفرت برقرار رہی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اُس وقت اس جدید تہذیب کے ساتھ کوئی بہت ہی قربت والا رابطہ (CLOSE CONTACT) نہیں تھا۔ اس دور میں آمدورفت اور رسل و رسائل کے ذرائع اتنے آسان نہیں تھے۔ انتہائی قلیل، معدودے چند لوگ ہوتے تھے جو ولایت جاکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی شاید کم۔ وہ آتے تھے مغربی تہذیب میں پورے رنگے رنگائے۔ ولایت پلٹ لوگ تو یقیناً اسی تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر کے آتے تھے۔ الّا ماشاء اللہ۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے وہ اتنے کم ہوتے تھے کہ اگر مجموعی لحاظ سے ہم جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اُس دور میں ان کا معاشرے پر بہت کم اثر تھا۔ بلکہ عوام الناس ان کو طنزیہ انداز میں پھبتی کے طور پر "لندن پلٹ" کہا کرتے تھے۔

یہ معاملہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے بعد ہوا ہے کہ ایک طرف تو اب جو ہمارے حکمران ہیں، وہ ہم میں سے ہیں۔ لیکن وہ کلیتہً اُسی تہذیب کے پروردہ ہیں اسی تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں، اسی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اسی کو انہوں نے عملاً اختیار کیے رکھا ہے اور ہمارے سرکاری محکمہ جات کے عمّال یعنی (BUREAUCRACY) ہے یا ہماری ملٹری کی جو TOP CLASS ہے۔ یہ سب ایک ہی ہیں۔ یہ سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ یہی اونچا طبقہ بہت سے اعتبارات سے ہمارے یہاں انگریز کا وارث بنا ہے۔ ان میں SIR رہے ہیں۔ اب ان کی اولاد ہے۔ خان صاحبوں

---

[1] اس طبقے کے افراد کو ٹوڈی کہا جاتا تھا۔ (مرتب)

اور خان بہادروں کی نسل بھی چل رہی ہے ان سب کی اکثریت اُسی انگریزی تہذیب کے رنگ میں مزید رنگ گئی ہے۔ جو ان کے آباؤ اجداد نے اختیار کی تھی ۔ انگریزی حکومت کے دور میں جو طبقہ انگریز سے قریب تر تھا، وہی طبقہ یا اُسی کی اولاد ہے جو اکثر و بیشتر ہماری حکومتی اور قومی سطح پر جو اجتماعی زندگی ہے اُس میں سب سے زیادہ اونچے مناصب پر فائز اور سب سے زیادہ فعال ہی عنصر ہے اب چوں کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے ہیں تو اُس وقت انگریزی تہذیب کے فروغ اور اثر و نفوذ میں کم از کم وہ نفرت روک اور آڑ بنی ہوئی تھی جو حاکم اور محکوم قوم کے مابین طبعاً موجود ہوتی ہے ۔ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی۔ نفرت کا وہ BARRIER بھی راستہ میں سے ہٹ گیا ۔ اب تو وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے افراد ہیں۔ "THEY ARE OUR OWN KITH AND KIN" اِن میں سے کسی کے نام کے ساتھ سیّد لکھا ہوا ہے ، وہ سیّد زادہ ہے، چاہے وہ فکری اور عملی اعتبار سے سرتاپا مغربی تہذیب میں غرق ہو چکا ہو، لیکن بہرحال نسلی اعتبار سے وہ سیّد ہے ۔ کوئی ہے جو خلفائے راشدینؓ یا دیگر اصحابِ رسول علی صاحبہم الصلوٰۃ والسلام و رضوان اللہ علیہم اور اہل بیت رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی اور خاندانوں سے خود کو منسوب کرتا ہے اس کے ناموں کے ساتھ، صدیقی ، فاروقی ، عثمانی ، علوی ، حسنی، حسینی ، زیدی ، جعفری وغیرہم کے لاحقے ہوتے ہیں۔ لیکن فکر و عمل کے اعتبار سے ان کا نام کے سوا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا الاّ ماشاء اللہ ۔ یہ لوگ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے عملاً بھی خاموش داعی اور نقیب ہوتے ہیں اور قولاً بھی ۔ پھر اسی طبقے سے عموماً اور اکثر وہ لوگ ابھرتے ہیں جو ہمارے یہاں " دانشور " کہلاتے ہیں ۔ تو اس طرح حاکم قوم کی تہذیب سے اس کی فکر سے محکوم قوم کو جو طبعاً نفرت ہوتی ہے ، وہ BARRIER اب ہمارے معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے ۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے محکمہ جات کے جو وارث بنے ہیں ان کا معاملہ وہ ہے جو ہمارے یہاں بطور محاورہ کہا جاتا ہے کہ " شاہ سے بڑھ کر شاہ کا خیر خواہ " تو یہ طبقہ درحقیقت وہ ہے جو انگریزی دور میں انگریز سے بڑھ کر مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا ۔ آزادی کے بعد اس میں کوئی کمی یا اصلاح کے عمل کے بجائے وہ اور ان کی اولاد اسی میں پختہ تر ہوتی چلی گئی ۔ اِلاّ ماشاء اللہ ۔

دوسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع رسل و رسائل آسان ہو گئے، آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو گئی ہے آزادی کے بعد سے ہمارے لوگ کثیر تعداد میں یورپ اور امریکہ گئے ہیں اور وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں تو تعلیم کے ساتھ وہ وہاں کے افکار اور تہذیبی اقدار کے جراثیم بھی ساتھ لے کر آئے[1]۔ ظاہر بات ہے کہ ان جراثیم کو ہمارے معاشرے میں پھیلنا ہی پھیلنا ہے اور ان حضرات کے بود و باش، وضع قطع اور خیالات و رجحانات، میلانات و تاثرات کا اثر ہمارے معاشرے پر پڑنا ہی پڑتا تھا۔ لہٰذا اصل تصادم اس وقت ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم مغرب کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ لیکن مغربی افکار اور اس کی تہذیبی اقدار کا غلبہ اس وقت زیادہ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے اثرات اب زیادہ نمایاں اور ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے اب وہ تصادم اور گہرا اور شدید ہو گیا ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کے پیشِ نظر آپ جب اجتماعی سطح پر اپنے معاشرے کا جائزہ لیں گے تو آپ اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے کہ وہ "COLLECTIVE WILL TO BE A MUSLIM" پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے۔ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ وہ طبقہ بہرحال ہمارے معاشرے میں زیادہ مؤثر طبقہ ہے۔ اسے اپنے مرتبے، اپنے مقام اور اپنی حیثیت کی وجہ سے معاشرے پر اثر انداز ہونے کے مواقع زیادہ حاصل ہیں۔

تیسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع ابلاغ نے نہایت وسعت حاصل کر لی۔ پچھلے دور میں اگر کوئی روزنامہ یا ماہنامہ یا ہفت روزہ دس پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا تو وہ کثیر الاشاعت کہلاتا تھا۔ اب اخبارات و رسائل لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں بعض ایک ہی وقت میں چند دوسرے بڑے شہروں سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ اب اکثر روزناموں، ماہناموں، خاص طور پر ڈائجسٹوں کی تعداد اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ڈائجسٹوں کی اتنی کثرت ہے کہ

کلامِ اقبال

---

[1] جناب اکبر الہ آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس صورتِ حال پر صادق آتا ہے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ (مرتب)

ہم سمجھتے تھے

ان کے ناموں کا شمار اچھا خاصا مشکل کام ہے - ابلاغ کے اس ذریعہ (MEDIA) پر بھی اسی مغربی تہذیب و افکار سے مرعوب ذہنیت رکھنے والوں کی اکثریت قابض ہے۔ پھر اخبارات و رسائل کی اشاعت اب باقاعدہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ ان کے مابین مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے لہٰذا ہر ایک اس کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ کہ عوام الناس کو لذت کوشی اور اباحیت پسندی میں مزید مبتلا کر کے زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرے۔ ان کی بلا سے کہ ہماری قوم کے افراد میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو ضعف پہنچتا ہے تو پہنچا کرے - وہ مزید مضمحل ہوتا ہے تو ہوا کرے - بلکہ یہ بات منفعت کے لحاظ سے ان کے لیے مفید ہے - لہٰذا ان کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے کہ قوم کس پستی میں گر رہی ہے - یہی حال اُن ذرائع ابلاغ کا ہے جو مکمل طور پر حکومت کے زیر انصرام و انتظام ہیں - یعنی ریڈیو اور ٹیلیویژن — ان میں ڈراموں، راگ اور موسیقی، رنگ ترنگ، اور اسی قبیل کے تفریحی پروگراموں کی بہتات ہوتی ہے جو SUGER COATED طریق پر معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے میں ضعف کا زہر پہنچا رہے ہیں — میں تو ٹی وی دیکھتا نہیں — الحمد للہ میرے یہاں ٹی وی کا گزر ہی نہیں ہوا ہے - لیکن دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ رہی سہی کسر وہ اشتہارات پوری کر دیتے ہیں جو کثرت کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں - پھر جو مذہبی پروگرام ہوتے ہیں وہ برائے بیت ہوتے ہیں اور یہ دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ ٹی وی پر دگراموں میں اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے مختص ہیں - اس میں ایسے دینی پروگراموں کی رسائی مشکل ہے جن سے قوم کو ایسا مثبت پیغام مل سکے جس سے اس میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا اجتماعی داعیہ پیدا ہو - پھر ان ذرائع ابلاغ پر مؤثر ترین گرفت اور HOLD اسی طبقے کی اکثریت کا ہے، جن کے اذہان و قلوب پر خدا ناآشنا مغربی افکار اور مغربی تہذیب کی بالادستی نقش و ثبت ہے - اس کی اکثریت کا اسلام سے محض مسلمانوں کے سے نام کے سوا شاید ہی کوئی عملی تعلق ہو تو ہو — یہ ہیں وہ اسباب اور یہ ہے اطراف و جوانب سے ہمارے معاشرے میں یلغار جس کی وجہ سے اگر اجتماعی سطح پر جائزہ لیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ " COLLECTIVE WILL TO BE A MUSLIM " وہ پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے، کمزور ہو چکی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے - لہٰذا

نتیجہ یہ نکلا کہ فی الوقت ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب، مغربی اقدار، مغربی تمدن، مغربی بود و باش اور مغربی طرزِ فکر کی زیادہ گرفت میں ہے اس کی بہ نسبت جب کہ آج سے چالیس برس قبل ایک مغربی قوم ہم پر براہِ راست حکمرانی کر رہی تھی۔

جب تک وہ اجتماعی ارادہ وہ "COLLECTIVE WILL" پیدا نہیں ہو جائے گی اور یہ بحثیں چھڑ جائیں گی تو وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ایک علمی بحث ہے اور چوں کہ اذہان تیار نہیں، دلوں میں حقیقی ایمان کی جوت موجود ہی نہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ اور وہ آمادگی دل میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ فلاں مسئلے میں اسلام کا حکم کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل کریں۔ لہٰذا لاحاصل بحث و مباحثہ اور CONTROVERSY کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے[1]

اب یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس COLLECTIVE WILL کو اسلام کی طرف لانے کا طریقہ کیا ہے! دوسرے یہ کہ اس کا ظہور کس طور سے ہوتا ہے! یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں COLLECTIVE WILL اسلام کے حق میں پیدا ہو چکی ہے، اسلام کے رُخ کی طرف آچکی ہے! ان دونوں سوالات پر تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ میں آئندہ کسی جمعہ میں کروں گا۔ اس وقت اجمالاً عرض کر رہا ہوں کہ نظری طور پر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتخابات کا عمل کسی ملک میں جاری ہو اور صحیح نہج پر جاری ہو۔ یہ نہ ہو کہ جس طرح گاڑی KNOCKING کرتی ہو، قدم قدم پر رکتی ہو، ایک انتخاب ہو یا ہونے والا ہو تو ایک ہنگامہ بپا ہو جائے جس کے نتیجے میں فوج TAKE OVER کرلے۔ پھر کسی نئے اسلوب اور نئے اصولوں پر انتخابات کا ڈھونگ رچایا جائے اور پھر اس کی وجہ سے کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو۔ پہلے کی جگہ دوسرا مارشل لا آجائے اور فوج کو تسلسل یا وقفے وقفے سے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا موقعہ اور جواز ملتا رہے۔ ایسا نہیں — بلکہ اگر کسی ملک میں واقعتاً

---

[1] مسلمان جینے، مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو پیدا کیے بغیر ان مسائل پر بحث و تمحیص بالکل ایسے ہی ہے جیسے گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے باندھ دیا جائے لہٰذا گاڑی آگے چلے تو کیسے چلے! (مرتب)

انتخابی عمل جاری رہے تو اس مسلسل انتخابی عمل کے ذریعے بھی COLLECTIVE WILL کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اس کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا چلا جائے گا کہ لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! وہ کیا چاہتے ہیں! ان کا رجحان کس طرف ہے! میرے نزدیک نظری طور پر یہ بھی ایک طریقہ ہے لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ ہمارے ملک کے موجودہ خاص حالات میں یہ طریقہ قریباً ناممکن العمل معاملہ بن گیا ہے۔ اس کی تفصیل، جیسا کہ میں نے عرض کیا، آئندہ کبھی عرض کروں گا۔

اب اس کے بعد دوسرا طریقہ رہ جاتا ہے، جسے آجکل "انقلاب" کا نام دیا جارہا ہے ــــ مجھے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں جب کہ میں بیرونِ ملک گیا ہوا تھا ــــ اسی شہر لاہور کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں ایک بڑی آن بان اور بڑی شان و شوکت کیساتھ ایک کانفرنس ہوئی ہے ــــ اگرچہ تاحال پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس نے منعقد کی تھی! اس کے داعی کون لوگ تھے! لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس کانفرنس میں بڑی دھواں دھار تقاریر ہوئی ہیں کہ یہاں ایران کی طرح کا انقلاب آنا چاہیے اور ہمیں اس میدان میں ایران کی قیادت کو قبول کر لینا چاہیے ــــ اس موضوع پر کہ "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے"! میں انشاء اللہ آئندہ جمعہ کو کچھ عرض کروں گا۔ اس وقت میں اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن یہ عرض ضرور کروں گا کہ معاشرے کی COLLECTIVE WILL کے ظہور کا دوسرا طریقہ یقیناً انقلابی طریقہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوگا کہ انقلابی طریقہ سے مراد کیا ہے! وہ یہ کہ اگرچہ ایک نقطۂ نظر اور ایک IDEOLOGY کے حامل اور قائل لوگ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوں۔ لیکن وہ دعوت و تبلیغ سے، اپنی محنت سے، اپنے ایثار سے، اپنی قربانیوں سے، اپنی تنظیم سے مشقت جھیل کر، مصائب برداشت کر کے وہ مؤثر اور EFFECTIVE ہونے کے اعتبار سے ایک اکثریت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یہ لوگ EFFECTIVE MAJORITY ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ NUMERICALLY وہ ایک اقلیت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی جدّوجہد اپنے ایثار و قربانی، اپنی استقامت و مصابرت اور اپنے موقف پر ایمان و ایقان کی طاقت سے کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی پسند کا نظام قائم کر دیتے ہیں[1] یہ انقلابی طریقہ ہے۔ لہٰذا کسی بھی COLLECTIVE WILL

[1] اگلے صفحہ پر

کے ظہور کے نظری طور پر یہ دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انتخابی عمل صحیح انداز اور صحت مند اصولوں پر جاری ہے تو وہ بھی ایک INDEX ہے ایک اشاریہ ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں! لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! لوگوں کے رجحانات و میلانات کیا ہیں! اور اگر یہ صورتِ حال نہیں ہے تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ انقلابی راستہ ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں اگر اللہ کو منظور ہوا تو گفتگو کسی آئندہ صحبت میں ہوگی۔

اس وقت ہمارے یہاں ان دو میں سے کسی بھی ذریعے سے اسلام کے حق میں COLLECTIVE WILL کا ظہور نہیں ہوا۔ بلکہ بالفعل صورتِ حال یہ ہے کہ ایک مارشل لا گورنمنٹ ہے۔ اس کی LEGITIMACY اس کا قانونی استحقاق ہی متنازع فیہ ہے۔ QUESTIONABLE ہے کہ یہ حکومت ہے تو کیوں ہے! آئی تھی تو کس دلیل سے آئی تھی! کس وعدہ کے تحت آئی تھی! اور اس حکومت کو اس وقت کی سپریم کورٹ نے تسلیم کیا تھا تو کن کڑی شرائط کے ساتھ کیا تھا! کیا کیا حد بندیاں اس پر عائد کی تھیں! لیکن یہ حکومت ہے کہ جس نے اپنے تسلسل کے لیے وجہ جواز یہ قرار دی ہے کہ ہم نے اس ملک میں اسلام قائم و نافذ کرنا ہے لہٰذا اس نے اس وجہ جواز کو ثابت کرنے کے لیے کچھ نیم دلانہ قسم کے اسلام کے لیے اقدامات کیے ہیں، جن کی وجہ سے قیل و قال، بحث و مباحثہ اور CONTROVERSIES بھر آئی ہیں۔ اس کے سوا اسلام کی طرف کوئی مثبت (POSITIVE) پیش رفت نہیں ہو رہی۔ بلکہ ہر معاملے میں نظر یہ آرہا ہے کہ دونوں نظریات کے حاملین کو شاید یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور دوسری طرف والوں کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ آپ مطمئن رہیں، میں کٹر آدمی نہیں ہوں۔ ایک طرف علماء کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں یہاں اسلام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھ لو میری نماز، میرا روزہ، ٹوپی مصلّے کا میرے ساتھ رہنا۔ یہ دین نہیں تو اور

لہ (سابقہ صفحے سے) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ یقیناً اللہ صبر کرنے، مصائب برداشت کرنے والوں کے ساتھ ہے" (البقرہ) (مرتب)

کیا ہے ۔ ا میرا پختہ عزم ہے کہ یہاں مضبوط بنیادوں پر اسلام کو نافذ کروں ۔ دوسری طرف یہ ہے کہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو جو اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی اکرام کے بہرحال مستحق نہیں ہیں، یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں اتنا کٹر نہیں ہوں آپ کو مجھ سے گھبرانا نہیں چاہیے ۔ پھر ان کی جس طرح حکومت کے ایک ایوان میں پذیرائی ہوتی ہے اور صدر مملکت صاحب نے جن کی منصبی مصروفیات کا سب کو علم ہے، ان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ساتھ تبادلہ خیال میں اخباری رپورٹ کے مطابق قریباً سات گھنٹے گزارے ہیں ۔ پھر جس گرم جوشی کے ساتھ ملک کی منصب کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ مقتدر اور بلند و بالا شخصیت نے اس طائفے کا استقبال کیا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس REGENE کے ہاتھوں پاکستان میں اسلام آرہا ہے ۔[1]

یہ جو تضادات ہیں، یہ جو دوعملی ہے، یہ جو دورُخا پن ہے اور یہ جو دوطرفہ عمل ہے اس نے ایک طرف تمام مخلص محبِ دین اور محبِ پاکستان عناصر میں شدید مایوسی پیدا کردی ہے، دوسری طرف اسلام کے ان مسلّمات کے بارے میں جو چودہ صدیوں سے متفق علیہ اور متفق علیہ چلے آرہے ہیں ناقابلِ برداشت نوعیت کی CONTROVERSIES کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے باعث ہمارے تعلیم یافتہ خاص طور پر نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقے میں سخت ذہنی انتشار بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام کس کو سمجھا جائے، اُسے جو خیر القرون سے نسلاً بعد نسلٍ علمائے حقانی کے توسط سے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے یا اُسے جو آجکل کے نام نہاد جدید مفسرین بالخصوص جدید "مفسرات" کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے ۔ جن میں شاید ہی چند افراد ایسے ہوں جو قرآن حکیم کی ایک چھوٹی سی سُورت کی بھی صحیح طور پر تلاوت کر سکیں ـــــ یا ان کو دین

---

[1] یاد ہوگا کہ جب مارچ ۸۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر کہ عورتوں کا دائرہ کار اسلام نے بالکل علیحدہ معین کیا ہے اور مخلوط اداروں میں خواتین کا مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا صریحاً اسلام کے خلاف ہے ۔ اُس پر مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ آرائی کی تھی تو ان کو اطمینان دلانے کے لیے اخباری رپورٹوں کے مطابق جناب صدر مملکت نے فرمایا تھا کہ "اتھارٹی میرے پاس ہے ڈاکٹر اسرار کے پاس نہیں ہے" ۔ (مرتب)

کے روزمرّہ کے معمولات کی ذرا بھی شُدبُد ہو۔

آپ بہ نظرِ انصاف ISLAMISATION کے اس PROCESS کا جائزہ لیں، جن کا پانچ چھ سال سے بڑا چرچا ہے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ہر قدم نیم دلی سے اور انتہائی ناقص انداز میں اٹھایا گیا ہے۔ حدود آرڈیننس کا جو حشر ہوا وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ کیا سرقہ پر آج تک کسی کو قطع ید کی سزا ملی ہے! کیا ڈاکہ زنی کے مجرموں میں سے کسی پر اسلامی حد جاری ہوئی ہے! زکوٰۃ آرڈیننس کا جو معاملہ ہے اس پر میں گذشتہ تقریر میں اظہار رائے کر چکا ہوں۔ اسلام کے کسی معاملہ میں بھی فیصلہ کن انداز کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ ورنہ آپ غور کیجئے کہ اخباری اطلاع کے مطابق اسلام کے قصاص و دیت کے قانون کو مدون کر کے اپنی مکمل رپورٹ اور سفارشات اسلامک آئیڈیالوجی کونسل نے چار سال قبل صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ یہ IDEOLOGY COUNCIL ——— کن لوگوں پر مشتمل ہے! انہی لوگوں پر جنہیں اس حکومت نے اور اسکے جو بھی کارپرداز اور اربابِ حل وعقد ہیں انہوں نے اس کونسل کے ارکان کو یہ سمجھ کر نامزد کیا تھا کہ یہ دین کے جاننے والے ہیں، سمجھنے والے ہیں ——— ہمارے یہاں جو مختلف فقہی مسالک یا فرقے ہیں یہ حضرات ان کے معتمد علیہ نمائندے ہیں۔ انہیں دین کا صحیح فہم اور شعور رکھنے والے جو بھی نظر آئے ان کو اسلامک آئیڈیالوجی کونسل میں رکھا۔ پھر علماء کے ساتھ اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک ہی کے نہیں بلکہ دوسرے چند اہم ممالک کے دساتیر اور قوانین سے بخوبی واقف ماہرینِ قانون و دستور کو بھی شامل کیا ——— اس کونسل نے متفقہ طور پر مسودّہ تیار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تمام فقہی مکاتیب فکر اور فرقوں کے علماء کی تائید بھی اُسے حاصل تھی۔ جدید آئین و دستور کے ماہرین کی توثیق بھی اُسے حاصل تھی۔ گویا کہ ایک متفقہ سند حکومت کو حاصل ہو گئی تھی۔ قصاص اور دیت کے مسئلہ میں اسلام کے مجمع علیہ قوانین یہ ہیں۔ اس کے بعد ایک "شوریٰ" وجود میں آگئی تو یہ مسودّہ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ شوریٰ میں اس پر بحث ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہاں تو دونوں ذہن یعنی دینی اور سیکولر (SECULAR) ذہن رکھنے والے لوگ جمع ہیں۔ یہاں تو وہ وکلاء بھی ہیں جو اسلام پر پھبتیاں چست کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ پھر وہ علماءِ دین بھی ہیں کہ بہرحال جن کے فہمِ دین پر لوگوں کی اکثریت کو اعتماد ہے ——— لہٰذا

محسوس ہوا کہ یہاں تو معاملہ آسانی سے نہیں چلے گا تو ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ کمیٹی کی رپورٹ آئی تو پھر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کمیٹی کے چیئرمین صاحب پر علماء کی طرف سے شدید الزامات عائد کیے گئے۔ علماء میں سے جو حضرات اس کمیٹی میں شامل تھے انہوں نے رپورٹ کو بالکلیہ DISOWN کر دیا کہ یہ رپورٹ ہماری نہیں ہے اس میں ہمارے نقطہ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس نے جو رپورٹ دی، وہ کابینہ میں زیر بحث آئی لیکن وہاں بھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ تا حال معلق ہے۔ البتہ اخباری اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ اب اس مسئلہ کے بارے میں عالم اسلام کے علماء سے رائے لینے کے مرحلے تک بات آگئی ہے۔ یہ سارا عمل غمازی کر رہا ہے کہ اصل میں پختہ ارادہ موجود نہیں ہے[1]۔ اگر پختہ ارادہ ہوتا تو بہت سے ضروری اسلامی قوانین کو اب تک حقیقی طور پر نافذ ہو جانا چاہیے تھا۔ درحقیقت اصل مسئلہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ ان کو بھی راضی رکھنا ہے، اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے، اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے۔ یہ بھی ناراض نہ ہوں اور وہ بھی ناراض نہ ہوں[2]۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرز پر جو بھی کام ہوگا، اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی اور عملی اعتبار سے انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پس میں نے اس CONTROVERSY میں اسی لیے اپنے آپ کو ملوث نہیں کیا کہ میرے نزدیک اس کا حاصل کچھ نہیں۔ یہ بالکل ایک بے محل بحث ہو رہی ہے۔ یا تو وہ اجتماعی ارادہ موجود ہوتا یا اس کو پیدا کرنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جاتے۔ جولائی ۷۷ء میں جب جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی حکومت قائم ہوئی ہے اور انہوں نے نوے دن میں انتخاب کرانے کے بجائے اس عزم کا اعلان کیا کہ MOST EARNESTLY

---

[1] انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے۔ "WHERE THERE IS A WILL _____ THERE IS A WAY" اگر عزم صمیم ہو کہ یہ کام بہرحال کرنا ہے تو راہ نکل آتی ہے۔ (مرتب)

[2] باغبان بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

(مرتب)

ان کی حکومت یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کرے گی تو نومبر ۱۹۷۷ء میں اسی شہر لاہور میں ہماری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں، مَیں نے یہ بات عرض کی تھی۔ چوں کہ مجھے جنرل صاحب کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک دین دار مسلمان ہیں۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ ماہنامہ میثاق کے اس زمانہ سے خریدار ہیں۔ جب وہ ملتان میں جی او سی تھے اسی زمانہ میں انہوں نے تفسیر تدبر قرآن منگائی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا دینی ذوق ہے، دینی مزاج ہے۔ اس میں دین سے شغف ہے۔ انہوں نے ہماری قرآن کانفرنس کے لیے پیغام بھی ارسال کیا تھا۔ لہٰذا اُس وقت میں نے عرض کیا تھا کہ "اب جب کہ اللہ نے آپ کو اس آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ آپ کے ہاتھ اس ملک کا اختیارِ کُلّی آگیا ہے"۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ مختارِ مطلق اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ امریکہ کا صدر بھی اتنا بااختیار نہیں ہے۔ وہ تو ملک بڑا وسیع ہے، وسائل بہت ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک بڑی شخصیت ہوتی ہے لیکن اختیارات کے اعتبار سے اس پر قیود ہیں، حدود ہیں۔ پابندیاں ہیں۔ بہت سے امور میں اُسے کانگریس سے منظوری حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اُسے اپنی پالیسیوں میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، اُس نے یا اس کی پارٹی کے دوسرے نامزد کو صدارتی انتخاب لڑنا ہوتا ہے۔ پارٹی کو پھر ووٹوں کی بھیک مانگنی ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان تمام حدود و قیود اور احتیاطوں سے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مبرا، محفوظ، مامون اور مطمئن ہوتا ہے۔ اُسے ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ انہی اعتبارات کے پیشِ نظر میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ "آپ کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہے، اب یہ ہے کہ اگر آپ واقعتاً اس آیت پر عمل کریں کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ تو آپ پورے کے پورے اسلام کو نافذ کیجیے۔ اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا۔ ایک حصہ نافذ کر دیا دوسرا نہیں۔ اس میں اپنی PRIORITIES بنالیا دین کی ترجیحات کو نظر انداز کر دینا۔ معاشرہ کا رنگ دیکھ کر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے، ان کو جانچنے پرکھنے کے لیے نفاذِ اسلام میں تدریج اختیار کرنا۔ پھر یہ کہ اس کا تجزیہ کرنا۔ یعنی اس کے اجزاء کرنا کہ دین کا ایک حصہ اس وقت نافذ کیا جائے اور دوسرے حصوں کو تعویق میں ڈالنا کہ پھر دیکھا جائے گا۔

یہ طرزِ عمل اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اس ضمن میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۵ ذہن میں رکھیئے گا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ اب تدریج کے لیے مکّی دور سے دلیل نہیں لائی جا سکتی چوں کہ اس وقت مکمل شریعت موجود نہیں تھی اس وقت تک احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اب وہ دَور دوبارہ نہیں آئے گا، مکمل شریعت حقہ موجود ہے۔ قرآن پورا کا پورا ہمارے سامنے ہے سنتِ رسول ایک روشن آفتاب کی صورت میں موجود ہے۔ ہماری تاریخ تاریک رات کے مانند نہیں ہے بلکہ لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا اس کی تو راتیں بھی اتنی روشن ہیں جتنے کہ دن روشن ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے دورِ سعید سے متصلاً بعد خلافتِ راشدہ کا زرین دور ہے۔ پھر اسکے بعد ائمہ فقہاء اور ائمہ حدیث کا دَور ہے۔ ہماری روشن تاریخ ہے جس کو سامنے رکھ کر ہمیں کامل دین کو لینا ہوگا۔ اس کے اجزاء کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ یہود کی اسی روش کے بارے ہی میں فرمایا گیا تھا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "کیا تم ہماری کتاب یعنی ہماری شریعت اور ہمارے دین کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے" فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ روش اور یہ رویّہ اختیار کرے گا اس کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اُسے ذلیل و خوار کر دیا جائے" وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ "اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے"۔ اس آیت میں ایک اٹل اصول، ضابطہ اور قاعدہ بیان کر دیا گیا ہے۔ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مکمل شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا اب تو TAKE IT ALL OR LEAVE IT والا معاملہ ہے۔ شریعت لینی ہوگی تو پوری لینی ہوگی ورنہ چھوڑ دیجئے۔ اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے، کوئی غرض نہیں ہے، اس کی کوئی ضرورت اس سے لاحق نہیں ہے۔ اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے کہ اس کی شریعت میں سے تھوڑی سی چیز مان لی جائے تو اس کا کام چل نکلے گا ورنہ کام اٹکا رہے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ — اسی لیے میں نے زور دے کر کہا تھا کہ "آپ پورا اسلام نافذ کیجئے، اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجئے گا"۔ ساتھ ہی میں نے صاف صاف یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ یہ کریں گے تو اس وقت معاشرے کی جو مجموعی کیفیت ہے تو یہ معاشرہ اُسے قبول نہیں کرے گا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کو اٹھا کر پھینک دے۔ آپ کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ جائے، لیکن اس کے باوجود آپ یہ کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی قربانی ہوگی۔ اللہ کے یہاں بھی آپ ماجور ہوں گے اور تاریخ میں بھی یہ بات ایک کارنامے کے طور پر درج ہوگی۔" میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "اگر ایک انگریز بادشاہ ایک عورت کے لیے برطانیہ کی حکومت کے تاج و تخت کو ٹھوکر مار سکتا ہے"۔ وہ بھی اس دور میں جب کہ برطانیہ کی حکومت اتنی وسیع تھی کہ کہا جاتا تھا کہ اس حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔" تو آج کا کوئی حکمران اگر اس لیے اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔ کہ وہ خود مسلمان جینا اور رہنا چاہتا ہے اور ملک میں بھی اسلام لانا چاہتا ہے۔ اگر اس وجہ سے حکومت سے محروم ہونا پڑے۔ تو یہ ایک بڑی شاندار اور تابناک مثال قائم ہو جائے گی" اس سے ایک جوش پیدا ہوگا۔ ولولہ اُبھرے گا، اُمنگیں جوان ہوں گی اور کروٹیں لیں گی، اسلام کے حق میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا۔ ان تمام مفاہیم پر مشتمل باتیں تھیں جو میں نے نومبر ۷۷ء کی قرآن کانفرنس میں جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کر کے کہی تھیں ــــ لیکن سات سال پورے ہو چکے ہیں اور اب آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے، ان سات سالوں کا جو ماحصل ہے، اس کی ہم جو BALANCE SHEET اپنے سامنے رکھ کر اُسے دیکھتے ہیں تو شدید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آتا کہ کچھ CONTROVERSIES ہیں، کچھ بحثیں ہیں جو بڑے زور و شور سے اخبارات و رسائل اور پبلک پلیٹ فارموں پر جاری ہیں۔ جن کا حاصل ذہنی الجھاؤ، پراگندگی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں ــــ جو بالکل ایک منفی کام ہے۔ عملی اعتبار سے ایک قدم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ زکوٰۃ کے بارے میں، میں گذشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں کہ اس نے کیا شکل اختیار کی ہے[1]! اب اقامتِ صلوٰۃ کا جو اقدام کیا گیا ہے، اس کے متعلق اخبارات میں جس قسم کے بیانات اور خبریں آ رہی ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹی وی پر بھی صلوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل کی بڑے زور و شور سے تشہیر کی جا رہی ہے۔ اس سے جو لوگ یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ اصل میں الیکشن کے لیے خالص تمہیدی قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے۔ تو جس انداز سے یہ کام ہو

---

[1] یہ مکمل تقریر میثاق کے اکتوبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مرتب)

رہا ہے، اس کے پیش نظر ان کے اس خیال کو غلط قرار دینا مشکل ہے۔ یہ رمز بھی اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام فوج ہی کے ذریعے قائم کیا جا رہا ہے۔ اسے سول بیوروکریسی کے بجائے فوجی نظام کے ساتھ منتھی کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ REGIME کا جو مہود ذہنی ہے۔ ان کے پیش نظر آئندہ کے لیے جو نقشہ ہے، اس میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ اس کی کوئی افادیت ہے، اس کا کوئی مصرف ہے۔ گویا نظام زکوٰۃ اور نظام اقامتِ صلوٰۃ کی پشت پر ایک سیاسی FACE اور IMAGE بنانا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی وجوہ ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ ان معاملات میں اگر بولوں تو اس کا فائدہ کیا ہے! حاصل کیا ہے! میں نے آپ کو بارہا بتایا کہ پردے کے سلسلہ میں گفتگو میرے اپنے کسی منصوبے اور ارادے کے تحت نہیں تھی۔ لیکن جب پوچھا جائے گا تو جو بات کتاب و سنت کے مطابق ہوگی وہ کہنی پڑے گی۔ پھر میں نے اس موضوع پر اپنی دو تقریروں میں اپنی استعداد کی حد تک کتاب و سنت کی تعلیمات پیش کیں۔ یہ تقریریں "میثاق" کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع ہوئیں۔ ملک کے ایک مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت روزنامے میں وہ قسط وار شائع ہوئیں۔ کتابی صورت میں بھی وہ اشاعت پذیر ہو چکی ہیں — پھر میں کیا اور میری بساط کیا! ملک میں ہمارے نامور اور جید علمائے کرام کی نہایت مبسوط کتب اس موضوع پر پہلے سے موجود ہیں[1]

لیکن کیا موجودہ حکومت نے ان کتب سے کوئی استفادہ کیا! کیا اسلامک آئیڈیالوجی سے استصواب کیا کہ ستر و حجاب کے متعلق شریعت کے احکام کیا ہیں! بلکہ مجھے یہ بات کہنے پر معاف کیا جائے کہ جو کام ترکی میں اتاترک نے اور ایران میں دونوں رضا شاہ پہلوی کے نام رکھنے والے بادشاہوں نے قانون، طاقت اور ڈنڈے کے زور سے کیا تھا، وہ موجودہ REGIME بڑی حکمت عملی سے انجام دے رہی ہے اور ان سات سالوں میں مغربی ذہن رکھنے والی خواتین کو نہ صرف یہ کہ کھلی چھوٹ دی گئی ہے کہ اسلامی

---

[1] راقم کے نزدیک اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی معرکۃ الآرا کتاب "پردہ" بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس موضوع پر تا حال حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے (مرتب)

نظامِ معاشرت کے خلاف وہ جتنا چاہیں زہر اگلیں ۔ بلکہ انہیں نمایاں طور پر آگے بڑھایا گیا ہے اور بڑھایا جا رہا ہے مختلف طور پر ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اس دور میں یہ کام جس پیمانے پر ہوا ہے اس کے عشرِ عشیر بھی پہلے کے تیس برسوں میں نہیں ہوا تھا۔

اب ان حالات کے پیشِ نظر قانونِ شہادت میں عورتوں سے متعلق شق پر اور قصاص و دیت کے مسودہ کے متعلق میں کچھ کہوں تو کیا کہوں! ۔ لیکن چوں کہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے اور بعض احباب کا اصرار ہے کہ قصاص و دیت کے مسئلہ پر جو متنازعہ بحث چلی ہے، اس کے متعلق میں کچھ عرض کروں ۔ پھر میرے سامنے حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی حدیث کا وہ حصہ بھی ہے جس پر بھی صحابہ کرامؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے کہ علی ان نقول بالحق اینما کنا ولا نخاف فی اللہ لومۃ لائم ــــ لہٰذا اس مسئلہ پر قرآن و حدیث سے اپنی استعداد اور اپنے فہم کے مطابق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ میں انشاء اللہ بعد میں عرض کروں گا ۔ اس وقت بطور یاد دہانی اس کام کا اعادہ کر رہا ہوں، جس کے لیے میں نے اپنے آپ کو کھپا رکھا ہے ــــ شاید کہ اس موقع پر میری بات چند لوگوں کے دل میں اتر جائے اور وہ جمود کو ختم کر کے آگے بڑھیں اور اس کام میں میرے اعوان و انصار بنیں ۔ یا اپنے طور پر منظم ہو کر اسی کام کی انجام دہی کی دھن ان کے سروں پر سوار ہو جائے ۔

میں نے قرآن حکیم اور سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو بھی معروضی مطالعہ کیا ہے اس کے نتیجے میں میرے سامنے اصل کرنے کا کام اور نہج یہ آیا ہے کہ دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو اس وقت تک بطور نظامِ حیات نہ نافذ کیا جا سکتا ہے، نہ وہ مستحکم رہ سکتا ہے ــــ جب تک معاشرے کے معتدبہ افراد میں مسلمان جینے، مسلمان مرنے کی COLLECTIVE WILL پیدا نہ ہو جائے ۔ میں تو اس اجتماعی ارادے کو پیدا کرنے اور اسے قوی کرنے میں لگا ہوا ہوں ۔ اس WILL، اس ارادہ اور اس داعیہ کا براہِ راست تعلق ہے ایمان سے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم اسی منبع اور چشمۂ رشد و ہدایت کو عام کرنے کے لیے میں نے ۱۹۶۵ء سے لے کر اب تک تقریباً بیس سال اپنی جوانی کے کھپائے اور لگائے ہیں ۔ جو بھی اس کے اثرات ہیں اور کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں نکلا! یہ علٰحدہ معاملہ ہے، یہ دوسری بات ہے ۔ میرے

پیش نظر حالات کو بدلنے کی کوشش ہے اس کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیئت پر ہے — میری اُخروی نجات کے لیے شاید میری یہ حقیر کوشش کام آجائے۔ بہر حال میں اسی کام میں ہمہ تن لگا ہوا ہوں اس لیے کہ میرا ایمان و یقین ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت، اس کے پیغام اور اس کے ساتھ صحیح تعلق ہی تجدید ایمان کا ذریعہ بنے گا۔ اسی سے ایمان کو تقویت حاصل ہوگی۔ اور یہی کام درحقیقت ہمارے معاشرے میں COLLECTIVE WILL کو پیدا کرنے کا موثر ترین ذریعہ بن سکتا ہے — اس سے اگلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ جن لوگوں کے اندر انفرادی سطح پر یہ ارادہ اور داعیہ پیدا ہو چکا ہے، انہیں جمع کیا جائے، انہیں منظم کیا جائے اور اسلامی انقلاب کے لیے قرآن کے علوم و معارف اور اس کی حکمت کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے علمی و فکری سطح پر کام ہو — پھر اسی منزل کی طرف پیش قدمی کے لیے سمع و طاعت کے اسلامی اصول پر ایک جماعت وجود میں آئے۔ میری پہلی کوشش کے لیے عنوان ہے: "مرکزی انجمن خدام القرآن" — اور دوسری کوشش کا نام ہے "تنظیم اسلامی" — تو میں اپنی ساری مساعی، ساری صلاحیتیں، ساری توانائیاں اصل میں ان دونوں کاموں میں صرف کر رہا ہوں۔ اس وقت جو CONTROVERSIES پیدا ہو رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں، اس میں دراصل LACKING عنصر ہے COLLECTIVE WILL کے فقدان کا — یہ سبب تھا اس معاملہ میں میرا اب تک بالکل خاموش رہنے کا۔

آج میں قصاص اور دیت کے بارے میں اپنی رائے پیش کر دیتا ہوں، اس فیصلے کی وجوہ میں بیان کر چکا ہوں کہ مجھ سے سوال بھی کیا گیا ہے اور از خود بھی لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ہوا ہوگا اس معاملہ میں جہاں تک دیت کا مسئلہ زیر بحث ہے، اس میں ایک اہم بات شاید لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ یہ قصاص والی دیت نہیں ہے۔ دیتیں دو ہیں۔ ایک دیت تو وہ ہے جو قصاص کے ساتھ BRACKET ہو کر آتی ہے، وحدانی شکل میں آتی ہے۔ ایک دیت بالکل علیحدہ ہے۔ ان دونوں کو جب تک آپ علیحدہ علیحدہ نہیں سمجھیں گے تو جو باتیں کہی جا رہی ہیں اور عقلی میدان میں جو گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں اس کا توڑ آپ کے لیے مشکل ہوگا — ایک ہے قتل عمد کا معاملہ — ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی دوسرے شخص کو قتل کیا ہے۔

اس کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے۔ اس کا شریعت میں، قانونِ اسلامی میں عنوان ہے قصاص جان کے بدلے جان ــــ اور اس میں جان بالکل برابر اور مساوی ہے عورت کی بھی اور مرد کی بھی۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ مقتول چاہے مرد ہو چاہے عورت اسی طرح قاتل چاہے مرد ہو چاہے عورت۔ ان چاروں حالتوں میں مرد و عورت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جانیں سب کی برابر اور مساوی ہیں ــــ یہاں جو قصاص ہے وہ جان کے بدلے جان ہے کہ قاتل کی جان اب مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم اور ان کی صوابدید پر منحصر کر دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو قاتل کی جان لینے ہی کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو قاتل یا اس کے لواحقین سے کوئی معاوضہ قبول کر کے اس کی جان بخشی کر دیں۔ ان دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنے کا بالکلیہ اختیار مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ اس میں حکومت کا عمل دخل یہ ہے کہ اس نے قاتل کو پکڑا۔ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے لیے یہ ممکن نہیں، اس کے لیے حکومت کی مشینری کی ضرورت ہے، جس میں پولیس ہے، عدالت ہے ــــ پولیس نے قاتل کو پکڑا۔ تفتیش کی۔ قانون اور عدل کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کیا۔ مقدمہ قائم ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ ملزم کے خلاف شہادتیں پیش ہوئیں۔ اس کی طرف سے صفائی پیش ہوئی۔ ہر نوع کی شہادتوں پر جرح ہوئی۔ یہ سارا کام حکومت کے ذمہ ہے۔ ان تمام PROCESSES سے گزر کر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا وہ چاہے جج یا قاضی نے خود دیا ہو یا جیوری کی رائے کے مطابق دیا ہو کہ ملزم کا جرم ثابت ہو گیا یہ شخص فلاں مرد یا فلاں عورت کے قتلِ عمد کا مجرم ہے تو اس کے بعد حکومت کا اختیار اور عمل دخل ختم۔ اب اس میں صدرِ مملکت کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اگر اب تک ہے تو یہ بالکل غلط ہے خلافِ اسلام ہے[1]۔ اب کسی کا

---

[1] اس کی خلافتِ راشدہ میں بڑی نمایاں مثال ملتی ہے۔ ابولولو فیروز نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا اس نے تو اس کے بعد فوراً خودکشی کر لی وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ لیکن قرائن اور واقعتی شہادتیں یہ تھیں کہ اس سازش میں ہرمزان بھی شریک تھا۔ وہ خلافتِ فاروقی میں مسلمان ہو چکا تھا اور مدینہ منورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھا۔ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رنج اور غصہ سے مغلوب ہو کر ہرمزان کو قتل کر دیا۔ جب کہ اسکو

(جاری)

کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ حکومت کا، نہ کسی گورنر کا، نہ صدر مملکت کا۔
اب یہ اختیار اسلامی قانون کے مطابق بالکلیہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ وہ چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی جان لینے کا فیصلہ کریں۔ حکومت اس کو EXECUTE کرے گی۔ اور اگر چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی بلا دیت و قصاص —— جان بخشی کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو قاتل یا مقتولہ سے یا ان کے ورثاء سے کوئی رقم بطور دیت قبول کر لیں۔
ایک اور اہم بات نوٹ کیجیے کہ یہ دیت جو قصاص کا قائم مقام بنتی ہے اس کا تعین نہیں ہے یہ معاملہ جانبین کی باہمی رضامندی سے طے ہوگا۔ اس سارے معاملے میں اصل میں جان کا بدلہ تو جان ہی ہے۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجیے۔ دیت کی وہ رقم مقتول یا مقتولہ کی جان کی قیمت ہرگز نہیں ہے۔ اس کی قیمت تو قاتل یا قاتلہ کی جان ہی ہے البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں اگر کہنا چاہیں کہ قاتل یا قاتلہ نے اپنی جان بچائی ہے اپنی جان کی قیمت ادا کر کے —— اگر اس نے دس لاکھ روپے دے کر یا اس کے اعزہ و اقارب نے، اس کے کہنے نے، اس کی برادری نے، اس کے قبیلے نے

(مسلسل) سازش میں ملوث ثابت کرنے کے لیے عدل و قانون کے متعلق کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت عبیدؓ کو گرفتار کیا گیا، ان پر قتل عمد کا مقدمہ چلا اور وہ مجرم قرار دیئے گئے۔ ہرمزان کا کوئی وہاں وارث نہیں تھا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اسلامی قانون کے مطابق خلیفہ وقت بحیثیت خلیفہ اس کا وارث قرار پاتا ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحیثیت وارث دیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عبیدؓ کے مالی وسائل دیت ادا کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی نے اپنی جیب خاص سے مقرر کردہ دیت ادا کی اور وہ بیت المال میں داخل کی گئی۔ حضرت عبیدؓ کے لیے جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند ہیں۔ "رحم" کرنے کی کوئی اپیل خلیفہ وقت کو پیش نہیں کی گئی۔ لہٰذا قاتل کو صوبائی گورنر یا صدر مملکت سے رحم کی اپیل کا حق دینا خلاف اسلام ہے۔ (مرتب)

ادائیگی کرکے قاتل یا قاتلہ کی جان بچائی ہے تو یہ دیت درحقیقت قاتل کی جان کا معاوضہ ہے نہ کہ مقتول کی جان کی قیمت ۔ یہ بدلہ قاتل کی جان کا ہے، مقتول کی جان کا نہیں ہے چوں کہ جان کا اصل بدلہ تو جان ہی ہے۔ اب اس فیصلے کا بالکلیہ اختیار مقتول کے ورثاء کی آزاد مرضی پر ہے۔ چاہیں دیت قبول کریں، چاہیں تو قبول نہ کریں اور قاتل کو موت کی سزا دلوا دیں ۔ یہ ہے قتل عمد کا معاملہ۔ اس میں مرد کی پوری اور عورت کی آدھی دیت کا سرے سے مسئلہ زیرِ بحث آتا ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ اگر زیرِ بحث آتا ہے تو یہاں آتا ہے اور اس میں قاتل چاہے عورت ہو یا مرد، اسی طرح مقتول. عورت ہو یا مرد۔ دیت کی رقم کا تعین مقتول کے ورثاء کریں گے اور وہ درحقیقت قاتل اپنی جان بچانے کے لیے دیت دے گا جو دراصل اس کی اپنی جان کی قیمت ہو گی۔

دوسرا مسئلہ ہے قتل خطاء کا جس میں قاتل یا قاتلہ کا اپنا کوئی ارادہ شامل تھا ہی نہیں۔ آپ گاڑی میں جا رہے ہیں کہ اچانک اور ناگہانی کوئی بچہ، کوئی عورت، کوئی مرد آپ کی گاڑی کے نیچے آگیا اور ہلاک ہوگیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا، آپ کی دشمنی نہیں تھی ۔ یا یہ کہ آپ کی دیوار کے نیچے کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دیوار گر گئی اور اس کے ساتھ یا اس کے نیچے جو شخص بیٹھا ہوا تھا، وہ ہلاک ہوگیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا ۔ یا آپ نے گولی چلائی تھی کسی شکار پر وہ جا لگی کسی انسان کو۔ آپ کا قطعاً کوئی ارادہ اس شخص کو مارنے کا نہیں تھا۔ قتلِ خطاء کی اور بھی بہت سی شکلیں اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں ۔ تو قتلِ خطاء وہ ہے جس میں قتل کا ہرگز کوئی ارادہ شاملِ نہیں ہوتا ۔ اب اسلامی قانون کا یہ ضابطہ نوٹ کیجیے کہ:۔

"قتلِ خطاء کے معاملے میں اب جان کے بدلے جان نہیں ہے۔ اس لیے کہ جان لینا اس قاتل کے پیشِ نظر تھا ہی نہیں۔"

اس قتلِ خطاء میں مقتول یا مقتولہ کے لیے جو دیت مقرر کی جائے گی وہ اس بنیاد پر ہے کہ اس خاندان کا نقصان کتنا ہوا ہے ۔ قاتل کا جرم اس اعتبار سے تو نہیں ہے کہ اس کا قتل کرنے کا ارادہ تھا ۔ وہ قتلِ عمد کا کسی اعتبار سے بھی مرتکب نہیں ہے لہٰذا اس قتل کی سزا کا ضابطہ جان کے بدلے جان نہیں ہے چوں کہ قتلِ خطاء سے ہوا ہے۔

اب چاہے قتل خطاء سے ہوا ہو لیکن اس خاندان کا تو نقصان ہو گیا ہے جس کا فرد مقتول ہوا ہے ۔ اس کے نقصان کی تلافی تو ہونی چاہیے اسکا COMPENSATION تو ہونا چاہیے ۔ اس کی تلافی حکومت اپنے بیت المال سے بھی کر سکتی ہے ۔ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھیئے یہ تلافی اس صورت میں حکومت کرے گی ۔ جب کہ قتلِ خطاء کا مجرم خود یا اس کے قریب ترین اعزّہ اس تلافی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اصلاً یہ تلافی اسلام نے اُس پر ڈالی ہے جو اس قتل خطاء کا مرتکب ہوا ہے ۔ کیوں ڈالی؟ اس کے اندر بھی حکمت ہے وہ یہ کہ اس سے احتیاط کا عنصر پیدا ہوگا — اگر ایسے ہر صورت میں حکومت کے ذمّے ڈالدیا جائے تو لوگوں میں احتیاط پیدا نہیں ہوگی ۔ لوگ گاڑی RASH چلائیں گے ۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات ہوگی کہ اگر کوئی گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک یا معذور ہو گیا تو اس کی دیت حکومت دیتی پھرے گی ۔ لیکن اگر ڈرائیور کو یہ معلوم ہو کہ یہ میرے سر پر آنے والی بات ہوگی تو اب وہ محتاط رہے گا یہ احتیاط معاشرے میں اسی شکل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اس قتلِ خطاء کا تاوان اُسی پر ڈالا جائے، جس کے ہاتھوں یا جس کے سبب سے یہ قتلِ خطاء ہوا ہے — البتہ مستثنیات میں یہ تلافی بیت المال سے حکومت کر سکتی ہے ۔

لیکن یہ جان کی قیمت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ اس نقصان کی تلافی ہے، اس کا COMPENSATION ہے جو اس فرد کے ہلاک ہو جانے کے سبب سے اس خاندان کو پہنچا ہے جس کا وہ فرد تھا ۔

اس دیت میں اسلام کے نزدیک مرد اور عورت میں فرق ہے ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام کا جو نظام ہے اس میں معاش کا بوجھ عورت کے ذمّے نہیں ڈالا گیا ہے ۔ جب کہ مرد کسی خاندان کا ایک EARNING MEMBER ہے ۔ وہ خاندان کی کفالت کے نظام کا ایک رکن ہے ۔ وہ حصولِ معاش کا ایک عضو ہے ۔ لہٰذا کسی خاندان کے کسی مرد کا قتلِ خطاء کے نتیجے میں ہلاک ہو جانا بڑا نقصان ہے بہ نسبت اس کے کہ اس طور پر اس خاندان کی کوئی خاتون ہلاک ہو جائے ۔ چنانچہ شریعت نے اس میں یہ فرق رکھا ہے کہ :—

قتلِ خطاء میں مرد کی دیت کے مقابلے میں عورت کی دیت آدھی ہو

جائے گی۔

اس میں جو حکمت ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ عقلی دلیل کے اعتبار سے بھی یہ بات عین عدل و قسط کے مطابق ہے اور واضح ہے کہ ہر سلیم العقل انسان اس کی معقولیت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے ۔ اس کے خلاف ایک عقلی دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں تو عورتیں بھی کمانے والی ہیں ۔ اس سے قطع نظر کہ شریعت کی کسی نص کے خلاف کوئی عقلی دلیل دینا ایمان کے بالکل منافی ہے ۔ اس طرزِ فکر سے ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑجاتی ہے ۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بِنَاءُ الفاسد علی الفاسد ہے۔ اسلام کے منشأ کے خلاف آپ نے ایک کارروائی شروع کی ہے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا کہ عورت پر معاش کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ اسلام نے عورت پر کچھ اور ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ وہ گھر میں بیٹھے اس کیلئے حکم ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ۔ وہ کیوں معاشی تگ و دو میں نکلی ہوئی ہے! وہ قناعت کرے، صبر کرے، اس کا شوہر جو کچھ کما کر لائے، اسی کے اندر گھر گرہستی کی ضروریات پوری کرے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا۔ اسلام نے معاش کی عورت پر ذمہ داری نہیں ڈالی۔ آپ نے خود یہ ذمہ داری عورت پر بھی ڈال دی اور اپنی اس غلط روش کو اسلام کے ایک دوسرے قانون کے خلاف دلیل بنا رہے ہیں۔ اسلام کا نظام اور قانون تو پورا کا پورا منطقی طور پر اور مربوط طور پر ایک وحدت ہے، ایک اکائی ہے۔ اس نے چوں کہ معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے، عورت پر نہیں ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وراثت میں بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دگنا حصہ دیا ہے۔ یہ ساری چیزیں مربوط ہیں۔ اس لیے کہ بیٹا ایک خاندان کا سربراہ بننے والا ہے یا بن چکا ہے۔ اُسے اپنے خاندان کی کفالت کرنی ہے جب کہ بیٹی بیاہ کر کسی اور خاندان میں چلی جائے گی یا جا چکی ہوگی اور اس کی کفالت اس کے شوہر کے ذمہ ہوگی ۔ لیکن عورت کو ایک قانونی STATUS دینے کے لیے اس کا بھی ایک تشخص ہے، اس کی بھی ایک حیثیت ہے لہٰذا وہ بھی اپنے والدین کے ترکے کی حق دار ہے۔ اُسے شریک تو رکھا گیا لیکن بھائی کے مقابلے میں اس کا حصہ نصف کر دیا گیا۔ لہٰذا اسلامی قانون کو جس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مربوط حکیمانہ نظام ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ ہے۔ اور یہ فلسفہ تمام جزئیات کو GOVERN کرتا ہے تمام جزئیات

اس فلسفے کے ساتھ مربوط ہوکر ایک وحدت بن جاتے ہیں جسے آپ ایک ORGANIC WHOLE کہتے ہیں۔ اب اگر اس پورے اور وحدانی قانون سے ہٹ کر کوئی روش اختیار کریں گے پھر اس سے اسلام کے کسی دوسرے قانون کے خلاف دلیل لائیں گے تو یہ میرے نزدیک بناءالفاسد علی الفاسد ہے۔ ایک غلط چیز پر بنیاد رکھ کر دوسری صحیح چیز کو غلط قرار دینا ہے۔ یہ درحقیقت اسی قبیل کی شے ہے جو آج کل قصاص و دیت کے مسئلہ میں سامنے لائی جا رہی ہے۔ ورنہ اسلام کا نظام اور قانون عقلی اعتبار سے بھی بالکلیہ عادلانہ اور منصفانہ ہے اور اس کا ہر جزو باہم دگر مربوط ہے۔ البتہ انتہا درجے کی مجبوری اور ضرورت ہو تو استثنائی شق قانون میں رکھی جا سکتی ہے لیکن یہ ایسے ہی ہونا چاہیے جیسے اضطرار کی حالت میں حرام کھانے کی شریعت نے رخصت رکھی ہے۔

اب آئیے ایک اہم اصول کی طرف ــــ جہاں تک نقل کا معاملہ ہے تو ہمارے دین میں نقل کو عقل کے مقابلے میں اقدمیت و اولیت حاصل ہے جس کے قدرے تفصیلی دلائل میں دورانِ گفتگو پیش کروں گا ــ اس ضمن میں آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں رجم کے متعلق بھی کچھ گفتگو کی تھی[1] اس ضمن میں ایک بڑی علمی شخصیت کی جو بفضلہٖ تعالیٰ بہ قیدِ حیات ہیں۔ جو عالمِ دین ہونے کے ساتھ صاحبِ تفسیر بھی ہیں۔ رجم کے بارے میں جو رائے ہے اس پر تنقید کی تھی۔ پھر ان کے ایک شاگردِ جوان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے غامدیہ خاتون کے متعلق جو نازیبا بات کہی تھی بلکہ بہتان گھڑا تھا کہ "وہ چکلا چلاتی تھی اس لیے اُسے رجم کیا گیا تھا" پھر یہی نوجوان ہیں جنہوں نے چند سال پہلے اپنے رسالے میں لکھا تھا کہ آج تک اسلام کا صحیح قانونِ وراثت اور کلالہ کے صحیح معنی و مفہوم اور قانون کو آج تک کسی نے سمجھا ہی نہیں ــ اس کو بس انہوں نے ہی سمجھا ہے جیسے وہ اب بیان کر رہے ہیں ــ تو بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ والا معاملہ سامنے آ رہا ہے۔

---

[1] یہ مکمل تقریر "میثاق" کے ستمبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مرتب)

تو ان امور کے متعلق میں نے عرض کیا تھا۔ تو شریعت کے معاملے میں یہ بات جان لیجیے اور آج میں نے جو بات عرض کی ہے، اس کے ساتھ جوڑ کر سمجھ لیجئے کہ جہاں کہیں بھی یہ آمادگی پیدا ہو جائے گی کہ مجھے مسلمان جینا ہے، مجھے مسلمان مرنا ہے اس کے لیے سب سے پہلی دلیل یقیناً قرآن مجید ہے۔ لیکن دین میں وہ تنہا دلیل نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے اُسے پہلی دلیل کہا ہے۔ جو قرآن حکیم کو تنہا اور واحد دلیل سمجھتا ہے اس کا راستہ ہم سے جُدا ہے۔ ہم ہیں اہل السُنّہ کہ جنہوں نے سنت کو دوسری دلیل مانا ہے۔ ہمارے نزدیک دلیل اوّل ہے قرآن مجید اور دلیل ثانی ہے سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور یہ بھی جان لیجئے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں ہے بلکہ ہے اگر اس کے تابع ہو تو اس کے تابع تو اولوالامر بھی ہیں۔ اس کے تابع تو والدین کی اطاعت بھی ہے۔ اس کے تابع تو ساری اطاعتوں کا نظام بن جائے گا۔ درحقیقت سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن کے تابع ہو کر دلیل نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ ایک برابر کی دلیل ہے۔ یہ دو ستون ہیں، یہ دو PILLARS ہیں جن پر شریعت کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایک ستون ہے اللہ کی کتاب قرآن مجید۔ ایک ستون ہے سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام[1] پھر فرض

---

[1] رسول کی اطاعت کے لیے قرآن مجید میں یہ کلیہ بیان فرمایا گیا ہے کہ۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ پہلی آیت میں "الرَّسُوْل" خاص ہے اور یہاں مراد جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر امر کے صیغے ہیں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ آیا ہے اس اسلوب کے معانی و مفاہیم میں جو زور ہے اس کی جو غایت و مطلوب ہے اس میں جو حکمت اور رمز ہے وہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے اور پھر چھ مقام پر اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ آیا ہے۔ گیارہ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی زبان سے کہلوایا ہے کہ "اَطِيْعُوْنِ"۔ پھر متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے رسول کی اطاعت اور اس کی معصیت سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

کیجیئے کہ سنتِ رسولؐ میں کسی معاملہ میں ابہام ہے۔ کہیں دو چیزیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ میں بظاہر کہہ رہا ہوں اس لفظ کو پیشِ نظر رکھیے۔ اس لیے کہ یہ چیز وہ ہے کہ محدثینِ عظام نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا کر چھان پھٹک کی ہے اور پھر فقہائے کرام نے اس کے اندر عقلی اعتبار سے، استدلال کے ذریعے سے مطابقت پیدا کی ہے۔ کہ ایک حدیث ہے جو عام بات بیان کر رہی ہے۔ دوسری حدیث ہے کہ اس کے اندر خاص بات بیان ہوئی ہے تو ایک حدیث گویا دوسری حدیث کے اتنے حصے کی ناسخ ہو جائے گی جو اس میں خصوص کا پہلو ہے۔ عام والا حصہ باقی رہ جائے گا۔ خاص والا معاملہ اب اس دوسری حدیث کی رو سے طے ہوگا۔ یہ معاملہ دنیا میں ہر جگہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی ہے عام و خاص۔ یہی حدیث کے اندر معاملہ ہے۔

اس کے بعد تیسری دلیل ہمارے یہاں سنتِ رسولؐ کے بعد ہے سنتِ خلفاءِ راشدین مہدیین۔ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث کے دوران یہ ارشاد آیا ہے: فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔" تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنّت کو جو میرے ہدایت یافتہ ہیں۔ پکڑو ان کو مضبوطی سے اپنے دانتوں کے ساتھ، داڑھوں اور کچلیوں کے ساتھ۔" یہ فرمانِ محمدی ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہاں کلمہ "فا" بہت معنی خیز ہے، یہ تمام اختلافات کے لیے پناہ گاہ کی طرف دلالت کر رہا ہے۔ خلفاءِ راشدین کی سنّت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہی کا تتمہ ہے۔

اس کے بعد ہمارے پاس چوتھی دلیل ہے ہمارے ائمہ دین، ائمہ فقہاء، استنباطات، ان کی تعبیرات اور ان کے قیاسات و اجتہادات ـــ جیسا کہ میں

(مسلسل) اس سے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی مقام واضح ہوتا ہے بلکہ سنت کا بھی، ویسے اتباعِ سنت کے لیے یہ آیت کریمہ نص کا درجہ رکھتی ہے کہ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۞

نے عرض کیا کہ شاید کچھ لوگ سمجھتے ہوں کہ ان پر قرآن آج نازل ہو گیا ہے کہ وہ جسطرح چاہیں اُسے INTERPRET کر دیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے اور تاریخ تاریک نہیں ہے بہت روشن ہے۔ یہ پچھلی دو تین صدیاں اگر ہمیں تاریک نظر آ رہی ہیں تو خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری پوری تاریخ تاریک ہے۔ ہماری بڑی تابناک تاریخ ہے ہماری اس تاریخ میں وہ ائمہ دین گزرے ہیں کہ جنہوں نے بڑی باجبروت حکومتوں کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اس رائے کا اظہار کیا ہے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ کا تصور کیجئے کہ حکومتِ وقت کے خلاف رائے دے رہے ہیں۔ ان کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر سیاہی مل کر پھران کو گدھے پر بٹھا کر پورے مدینہ میں پھرایا جا رہا ہے۔ لیکن اس حال میں بھی وہ کہہ رہے ہیں "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک ابن انس ہوں اور میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کر کے اگر طلاق دلا دی جائے تو وہ طلاق ہو گی یا نہیں ہو گی[1]

اب یہ ایک مسئلہ ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ کسی کو امام مالکؒ کی رائے سے اختلاف ہو۔ لیکن ہمارے ائمہ دین وہ ہیں جو کسی جبر اور کسی تشدّد کے سامنے نہیں جھکے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جیلیں کاٹی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انہیں زہر دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے سختیاں برداشت کی ہیں، کئی بار شہر بدر کئے گئے ہیں۔ امام ابن حنبلؒ نے وہ ماریں کھائی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہاتھی کی پیٹھ پر وہ مار پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ امام ابن تیمیہؒ دو مرتبہ محبوس کئے گئے۔ قید کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ تو کیا ان ائمہ کے بارے میں ہم یہ سمجھیں گے کہ دین اور شریعت کے بارے میں غور و فکر

---

[1] حکومت وقت کو اس مسئلہ میں تشدّد کی ضرورت اس لیے درپیش ہوئی کہ خلیفہ وقت کے لیے بالعموم بالجبر بیعت لی جاتی تھی۔ اگر طلاق مکرہ کو غیر مؤثر تسلیم کر لیا جائے تو حکومت کو خطرہ لاحق تھا کہ جبری بیعت کو بھی اس پر قیاس کر کے بیعتِ مکرہ سمجھا جائے گا۔ اور اس طرح یہ بیعت غیر مؤثر ہو جائے گی۔ (مرتب)

اور صحیح تر رائے تک پہنچنے میں انہوں نے کوئی کسر چھوڑ دی ہوگی! انہوں نے کیا یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہوگی کہ فلاں فلاں مسائل میں قرآن کا صریح تقاضا کیا ہے اور سنت کی نصوص کون کون سی ہیں اور وہ مسائل کون کون سے ہیں جن پر خیر القرون سے اجماع اور تواترِ عمل چلا آرہا ہے! رہے ایسے مسائل جن کی تعبیر و قیاس کے بارے میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ ان میں البتہ ایک گنجائش ہوگی۔ میرے لیے بھی گنجائش ہوگی۔ آپ کے لیے بھی گنجائش ہوگی۔ خلف کے علماء کے لیے بھی گنجائش ہوگی کہ وہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں، یہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں، امام حدیث ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے، اِن کی رائے یہ ہے۔ تو فقہی مسائل میں میدان وسیع ہوگیا۔

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل ہو، ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو۔ سلفی مسلک رکھنے والوں کا اتفاق ہو ان سے باہر نکلنا میرے نزدیک فتنہ ہے۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ یہ محض جذباتی بات نہیں ہے بلکہ نہایت غور و فکر کے نتیجے میں میری پختہ اور اٹل رائے ہے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل موجود ہو، ائمہ اربعہ کا اتفاق موجود ہو، محدثین متفق ہوں، تمام واجب الاحترام اور معتمد ترین رجالِ دین کی رائے جن مسائل میں یک جا ہو جائے، وہ مجمع علیہ مسائل کی فہرست میں ہیں اسی کا نام اجماع ہے۔ یہ اجماع بھی دین میں حجت ہے۔ یہ چوتھی دلیل کا حاصل ہے[1] اور اُس کے خلاف رائے دینا اور اپنی رائے

---

[1] آج سے کئی سال قبل امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ اس میں یہ بات بھی درج تھی کہ امام موصوف قرآن مجید سے بھی "اجماع" کے حجت ہونے کی دلیل کے متلاشی تھے۔ لیکن امام صاحب کا کہنا یہ تھا کہ تین مرتبہ تلاوت قرآن اور غور و فکر کے بعد بھی یہ دلیل نہ مل سکی۔ (واضح رہے کہ کہا جاتا ہے کہ امام موصوف عموماً تین دن میں قرآن کی تلاوت مکمل کر لیا کرتے تھے)۔ ایک روز امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے "اجماع" کے حجت ہونے کی دلیل بھی قرآن مجید سے ان پر واضح

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پر اصرار کیے جانا میرے نزدیک یقیناً اور لاریب فتنہ ہے۔

• میرے بعض احباب کو جن کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں، مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہے کہ میں شاید ایک خاص معاملے میں سختی کر رہا ہوں۔ بعض نے مجھ سے کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ میں ان تمام حضرات سے گذارش کروں گا کہ شخصیتوں کو سامنے رکھ کر خدارا نہ سوچیے بلکہ یہ سوچیے کہ مجمع علیہ مسائل یا اجماع سے ہٹ کر کسی نص، کسی دینی مسئلہ اور متفق علیہ حدود شرعیہ کے خلاف راستہ نکالنا اور رائے دینا اور اجتہاد کرنا اسلاف کے ساتھ قطع تعلق ہے یا نہیں! ان تمام کی متفق علیہ رائے پر اظہار عدم اعتماد ہے کہ نہیں! میں صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں میں کسی مداہنت کا روادار نہیں۔ میں اسے حمیّت و غیرتِ دین کے منافی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کون خوش ہوتا ہے، کون ناخوش۔ کون راضی رہتا ہے اور کون ناراض ہو جاتا ہے۔ شخصیتوں کو چھوڑ کر مسئلہ کی FACE VALUE پر تبادلہ خیال، افہام و تفہیم اور دینی استدلال کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔ نہ کسی کی دلداری کبھی پیش نظر رہی ہے اور نہ کسی کی ناراضگی سے خوف

(مسلسل) کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ تین سو ایک مرتبہ تلاوت کے دوران اچانک ان کی نگاہ اس آیت پر جم گئی اور منکشف ہوا کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔ آیت یہ ہے: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (آل عمران ۱۱۵) امام موصوف کی رائے یہ ہے کہ "یہاں سبیل المؤمنین سے قطعی طور پر اجماع مراد ہے" ــــ یہاں مؤمنین سے وہ مؤمنین صادقین، جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جیسے تابعین، تبع تابعین، فقہاء امت، محدثین کرام علماء حقانی، مراد ہیں جن کے قلوب حقیقی ایمان و ایقان کے نور سے منور تھے نہ کہ ہم جیسے کچے پکے اور روائتی مسلمان۔ (مرتب)

کھایا ہے۔ کسے باشد۔ اپنے دینی فہم و شعور کے مطابق جس بات کو حق سمجھا ہے اُسے برملا بیان کیا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے نزدیک خلفاء راشدین ائمہ مجتہدین، محدثین کرام کی مجمع علیہ متفق علیہ رائے اور مسائل کے خلاف اب کوئی نئی رائے دینا اور کوئی نئی راہ نکالنا یقیناً فتنہ ہے۔

یہ ہیں وہ اصل الاصول جن کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے۔ یہی معاملہ رجم کا ہے۔ زنا کی حد کی آیتِ قرآنی کے بموجب سو کوڑے غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے حد عام ہے لیکن اُسے سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے، اور سنتِ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شادی شدہ مرد اور عورت کی طرف سے زنا کے ارتکابِ جرم پر رجم کو مستقل حد قرار دے کر خاص کر دیا۔ اس پر اجماع چلا آرہا ہے۔ خلفاء راشدین مہدیین کے تعامل و تواتر کی پوری طرح تحقیق کے بعد فقہ کے مشہور ائمہ اربعہ نے شادی شدہ مرد و عورت کے لیے رجم کو "حد" قرار دیا۔ لہٰذا اس پر تواتر کے ساتھ اجماع چلا آرہا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ یہ ثابت شدہ سنت ہے۔ احادیث نبویہ ہیں۔ سنت اور حدیث دونوں جمع ہوگئیں۔ پھر یہ کہ خلفاء اربعہؓ کا اس پر عمل ہے۔ ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ نہ صرف ائمہ اربعہؒ کا بلکہ اس میں امام بخاریؒ ہوں، امام مسلمؒ ہوں، امام ابن حزم ظاہریؒ ہوں۔ الغرض اہل سنت کے تمام معتمد علیہ محدثین کا اس مسئلہ میں کامل اتفاق ہے۔ اسی طرح اہل تشیع جو بالکل علیحدہ فرقہ ہے اس کے جو مستند ائمہ فقہ ہیں جن میں امام جعفر صادقؒ ہوں۔ امام زیدؒ ہوں سب کے سب اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی اسلامی مستقل حد "رجم" ہے۔ خوارج اور گنتی کے چند معتزلہ ہیں جو اسے حد تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فرقے اہل سنت والجماعت سے علیحدہ تسلیم کئے گئے ہیں اور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے اب آپ خود ہی نتیجہ نکال لیجئے کہ اس متفق علیہ اور مجمع علیہ مسئلے کے خلاف ایک نیا راستہ نکالنا اگر فتنہ نہیں تو کیا ہے۔!

قصاص و دیت کے مسئلہ کو بھی انہی دلائل سے سمجھ لیجیے جو رجم کے اسلامی حد ہونے کے بارے میں، مَیں نے پیش کئے ہیں چوں کہ اصول تو ایک ہی نہیں ـــــ دیکھیئے

قرآن مجید میں قصاص والا مسئلہ سورہ بقرہ میں زیرِ بحث آیا ہے۔ اور قتلِ خطاء کی دیت کا ذکر سورہ نساء میں ہے۔ لیکن مقادیر وغیرہ کا کوئی ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں عورت اور مرد میں فرق ہے یا برابری ہے' اس کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ قرآن مجید کے دو اصول اور ہیں جن کو دینی اصطلاح میں "نص" کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کی لفظ بلفظ (LITERALLY) تعمیل ہوگی۔ ایک عورت کی شہادت کا معاملہ ہے تو وہ مرد کی شہادت سے نصف ہوگئی۔ دوسرے قانونِ وراثت کے پورے قانون کو دیکھیں گے تو عورت ترکہ میں مرد کے مقابلے میں نصف کی حق دار بنتی ہے۔ دلالۃ النص سے اگر آپ کوئی چیز ثابت کرنا چاہیں تو یہ دو اصول قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن اور کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ اب آپ حدیث کی طرف آئیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث QUOTE ہو رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث ہے اُسے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت عمرو بن حزمؓ کو حضورؐ نے ایک تحریر لکھوا کر دی وہی QUOTE ہو رہی ہے اس میں ایک کلی قانون بیان ہوا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: فِي النَّفْسِ الْمُؤْمِنَةِ مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ۔" ایک مؤمن جان" یہاں چونکہ عام ہے لہٰذا اس کا اطلاق دونوں پر ہو سکتا ہے مؤمن مرد پر بھی اور مؤمن عورت پر بھی [۱]۔" ایک مؤمن جان کی دیت قتلِ خطاء کی صورت میں سو اونٹ ہوں گے"۔ ایک دوسری حدیث میں یہ بات بھی موجود ہے دیۃ المرأۃ على النصف من دیۃ الرجل[۲]۔" عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہے"۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک حدیث نے دوسری حدیث کو خاص کر دیا۔

---

[۱] لفظِ المؤمنۃ سے مغالطہ نہ ہو۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر موصوف مؤنث ہو تو صفت بھی مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوگی۔ نفس عربی زبان میں مؤنث ہے لہٰذا صفت بھی مؤنث آئی ہے مراد جنس مومن ہے۔

[۲] "ہدایہ" جلد دوم میں وضاحت ہے کہ یہ حدیث حضرت علی سے موقوفاً مروی ہے اور یہ حدیث مرفوعاً بھی ثابت ہے (مرتب)

ایک میں عام ہے کہ قتلِ خطاء کے مقابلے میں ایک مومن جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ دوسرا قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ ہم عام و خاص کی نسبت سے دونوں حدیثوں کو مانتے ہیں۔ دونوں کے مابین ایک ربط قائم ہے کہ ایک عام بات حضورؐ نے فرمائی اس کے ایک جزو کی حد تک خصوص دوسرے قول سے ہوگیا۔ لہٰذا ان دونوں کو سامنے رکھیے تو مسئلہ بالکل واضح ہوجائے گا۔ جو شخص اتباعِ رسول کا جذبہ رکھتا ہوگا اُسے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ملے گی۔ وہ کوئی اپنا قول نہیں لگائے گا، اپنی کوئی دلیل نہیں دے گا۔

آگے چلیئے۔ ہمارے خلفاءِ راشدین مہدیین میں چار میں سے تین کے اقوال موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول موجود، حضرت عثمانؓ کا قول موجود، حضرت علیؓ کا قول موجود رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم اجمعین کہ عورت کی قتلِ خطاء میں دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ اسی پر ان کا قول، اسی پر ان کا عمل ـــــ صحابہ کرامؓ میں سے تین عبادلہ بہت مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ وہ صحابی ہیں۔ جن سے ساری فقہ حنفی چلی ہے۔ اسی لیے اس کو فقہ عبداللہ ابن مسعود بھی کہا جاتا ہے۔ چوں کہ کئی واسطوں سے ان ہی کے پیرو ہیں امام ابوحنیفہؒ۔ دوسرے عبداللہ ابن عباسؓ ہیں جن کے لیے حضورؐ نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ اس نوجوان کو قرآن کا علم عطا فرما دے"۔ وہ حبرالاُمّہ کہلاتے ہیں۔ اُمت کے سب سے بڑے عالم۔ لہٰذا جو اکثر تفسیری روایات ہیں عموماً ان کے متعلق ہر معتمد تفسیر میں آخری بات حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کی ملے گی۔ تیسرے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہیں تو حدیث کے سلسلے میں جو سلسلۃ الذہب مشہور ہے، جو سنہری زنجیر ہے، اس کی پہلی کڑی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ـــ یہ تین عبادلہ اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ ان تینوں کے اقوال بھی اس کے حق میں موجود ہیں۔ پھر حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَفْرَضُھُمْ اُمَّتِیْ زید بن ثابت "میری امت میں قانونِ وراثت کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں"۔ ان کا قول اس کے حق میں موجود ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جس میں یہ جذبہ پیدا ہوچکا ہو کہ مجھے اسلام پر چلنا ہے، کیا اس کے لیے اس مسئلہ میں اتنے شواہد کے بعد بھی کسی شک و شبہ

کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے ؟ ـــــ آگے چلیئے۔ ائمہ اربعہ، امام امالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا اس پر اتفاق ہے۔ مزید یہ کہ اہل تشیع کے دو ائمہ امام جعفر صادق اور امام زید رحمہما اللہ کا بھی اس پر اتفاق ہے جیسے سب کا اتفاق رجم کے مسئلہ پر ہے۔ اب بتایئے کہ جس شخص کے دل میں کوئی رمق بھی ایسی موجود ہو کہ وہ اسلام کے مجمع علیہ، متفق علیہ تمام مسائل کو تسلیم کرنا چاہتا ہے، وہ اس مسئلہ میں کوئی اپنی علٰحدہ رائے رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے! یوں تو کوئی شاذ رائے اکثر معاملات میں مل جائے گی۔ مجمع علیہ اور متفق علیہ آرا کے مقابلے میں شاذ رائے کی کھوج کرید کرنا اور اس سے دلیل پکڑنا چاہے وہ رائے الاصم کی ہو، چاہے ابن علیہ کی ہو، آخر اس کی ضرورت کیا ہے[1]۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کا علمی اعتبار سے مقام و مرتبہ کیا ہے! ان کی حیثیت کیا ہے! کیا اہل سنت کے جو چار مسلک ہیں اور جو سلفی اور ظاہری مسلک ہیں، کیا ان مسالک میں سے کسی میں ان کی رائے اور قول کی کوئی اہمیت اور حیثیت ہے! صحابہؓ بالخصوص تین خلفاء راشدین کے قول و عمل، تابعینؒ، تبع تابعین، ائمہ اربعہ اور تمام معتمد فقہائے اسلام کے مجمع علیہ اور متفق علیہ رائے کے مقابلے میں اِدھر اُدھر سے کھود کرید کر کے کسی شاذ اور غیر معروف قول پر استدلال کی عمارت کھڑی کرنا اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ اصل میں جذبہ تو ہے نہیں۔ پیروی تو کرنی نہیں، وہ ارادہ موجود ہی نہیں کہ ہم کو اسلام پر چلنا ہے اور اسلام پر عمل کرنا ہے۔ لہٰذا یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ آدمی کے پاس زبان ہے اور گز گز بھر کی زبان بھی موجود ہے اور لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے جن کو ہمارے اخبارات نے گزوں لمبا کر دیا ہے۔ قلم کا پہلے اتنا فتنہ نہیں تھا جو اس دور میں اخبارات کے ذریعے سے یہ فتنہ شدید تر ہو گیا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ CONTROVERSIES زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ سیاست کا میدان تو بند پڑا ہے اس کے حوالے سے جو گرما گرمی ہوتی تھی اور نمک مرچ ملتا تھا،

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ "ان حضرات کا یہ قول کسی مستند کتاب میں صحیح اسناد کے ساتھ نقل بھی نہیں ہوا؟" (مرتب)

اور اخبارات کی زینت بنتا تھا، وہ موجود نہیں تو جہاں سے بھی بحث و تمحیص کا دروازہ کھل جائے اسے وہ نمایاں کریں گے۔ چوں کہ اس میں ان کے قارئین کی دلچسپی کا سامان ہے اس کے سوا ان کے پیش نظر کوئی مثبت یا منفی تعلق یا مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی منفی تعلق ہو تو ہو۔ باقی مثبت تعلق کا تو ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں ملے گا۔ یہ ہے اصل معاملہ کہ اگر کسی کو بات سمجھنی ہو اور فی الواقع سمجھنا ہو تو اس میں قطعاً کسی شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قتل خطأ میں مرد کے مقابلے میں عورت کی دیت نصف ہے

میں پھر عرض کروں گا کہ اصل بات یہ ذہن میں رکھیے کہ دو چیزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر وہ WILL ہے یا نہیں۔ فیصلہ کن بات تو یہ ہے۔ دوسری یہ کہ جب انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ WILL پیدا ہو جائے تو پھر عمل کے لیے ترتیب یہ ہے۔ کہ پہلے اللہ کی کتاب ہے پھر سنتِ رسول ہے۔ اس سنت کے اندر صحابہ کرامؓ کے اقوال بھی آجائیں گے۔ اس لیے کہ انہیں بھی احادیث کہا جاتا ہے۔ یہ بات بھی احادیث ہیں جو مرفوع نہیں موقوف ہیں لیکن حدیث کے درجے میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ سنت کا ایک جزو ہیں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات دلالت کرتے ہیں۔ پہلا ارشاد ایک حدیث کا آخری حصہ ہے: ما انا علیہ واصحابی "ہدایت یافتہ اور راہ یاب لوگ وہ ہوں گے جو میرے (یعنی نبی اکرمؐ) طریقے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلیں گے۔" دوسرا ارشاد ہے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ "میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، ان میں سے تم جس کی بھی اقتدا پیروی اختیار کرو گے راہ یاب ہو گے"۔ پھر خاص طور پر خلفاء اربعہؓ کی سنت ہے۔ جس کے سنت ہونے پر ہمارے تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقانی بلکہ پوری امت کا اجماع ہے۔ جس کے لیے دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جو میں نے آغاز میں آپ کو سنائی تھی۔ اس کی تشریح کرنی باقی ہے۔ اس موقع پر وہ تشریح پیش کیے دیتا ہوں۔ اس حدیث سے ہمیں وہ رہنمائی بھی مکمل طور پر مل جائے گی۔ جس کی اس پُرفتن دور میں ہم کو سخت احتیاج ہے۔ یہ حدیث حضرت عرباض ابن ساریہؓ سے مروی ہے اور امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے اسے "حدیث حسن صحیح" قرار دیا ہے ـــــ حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں کہ وَعَظَنَا

رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَوْعِظَۃً وَجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ وَ ذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اور نصیحت ایسی تھی کہ اس سے قلوب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ لرز گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے "۔ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَاَنَّھَا مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا ۔" ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ نصیحت تو ایسے محسوس ہو رہی ہے جیسے آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں! (اگر یہ اسی نوعیت کی ہے) تو ہمیں مزید وصیت و نصیحت فرمائیے"۔ قَالَ اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ ۔" حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور سمع و طاعت کی روش پر کاربند رہنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ تمہارا امیر ایک غلام ہی کیوں نہ ہو!"۔ اس وصیت کے آخری حصے میں یہ حکمت ہے کہ غلام یا غلام زادے کا امیر بننا عرب جیسی آزاد اور خود سر قوم کے نفس پر بڑا شاق گزرنے کا احتمال تھا۔ نبی اکرمؐ نے اس کی اس موقع پر پیش بندی فرمادی ۔ اس کے بعد رسول اللہ نے فرمایا فَاِنَّہٗ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔" تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا"۔ آگے حضورؐ ہدایت اور راہنمائی فرما رہے ہیں۔ کہ اختلافات کے زمانے میں امت کے لیے مشعلِ راہ کون سی ہے۔! روشنی کا مینار کون سا ہے! ارشاد ہوا: فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ ۔

"پس تم پر واجب ہے، لازم ہے کہ میری سنت اور میرے تربیت و ہدایت یافتہ صراطِ مستقیم پر گامزن خلفاءؓ کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا"۔ آگے فرمایا وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ ۔" اور دیکھو دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہوگی اور بدعت گمراہی ہوتی ہے۔"

اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہاء کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے علیحدہ اور اس سے باہر کوئی نیا راستہ کوئی ایسا شخص،

نہیں نکالے گا جس کے دل میں حقیقی دین پر عمل پیرا ہونے کے جذبے کی کوئی رمق بھی موجود ہو۔ اگر نکالے گا تو وہ اسی دائرے اور اسی زمرے میں آجائے گا کہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ جو شخص بھی فرماں برداری (اسلام) کے سوا کوئی اور طریقہ اور راستہ اختیار کرنا چاہے گا، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامراد و خاسر رہے گا لہٰذا جو بھی اسلام کے احکام و قوانین کے علاوہ اور غالبے اور طریقے کا متلاشی ہے، وہ تو باہر ادھر اُدھر جھانکے گا اور اپنی رائے کے لیے عقلی اور نقلی دلیلیں گھڑے گا۔ وہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا کے زمرے میں آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو میں پورے انشراحِ صدر سے کہتا ہوں کہ عقل بھی اس کے حق میں ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے کہ قوتِ کار کے اعتبار سے اور معاشی کفالت کے لحاظ سے مرد کی منفعت عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔[1] اس دلیل سے میراث میں، قانونِ شہادت میں اور زیرِ گفتگو قتل خطاء کی صورت میں عورت کی دیت میں نصف کی نسبت عقل کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ اسی طریقے سے رجم کے "حد" ہونے کے منکرین بھی عقل کے اعتبار سے اندھے اور کورچشم ہیں کہ وہ گویا عقلی اعتبار سے یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی برابر کے مجرم ہیں۔ ذرا ان کی عقل پر ماتم کیجیے۔ ایک پیٹ بھرا انسان چوری کرے اور ایک غیر پیٹ بھرا انسان چوری کرے، کیا یہ برابر ہو جائیں گے! ایک چوری ہے جو ہیرے جواہرات کی کی جا رہی ہے، ایک چوری وہ ہے جو روٹی کی کی گئی ہے یا راہ چلتے کسی باغ کے پھل توڑ کر اپنا پیٹ بھرا گیا ہے۔ کیا یہ چوریاں برابر سمجھی جائیں گی! شریعت نے انہیں برابر نہیں رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں قحط کی حالت میں قطع ید کی سزا بالکل ساقط کر دی تھی اس

---

[1] "ہدایہ" میں علامہ مرغینانیؒ کا یہ قول موجود ہے: وَلِاَنَّ حَالَهَا اَنْقَصُ مِنْ حَالِ الرَّجُلِ وَمَنْفَعَتُهَا اَقَلُّ۔ "بلاشبہ عورتوں کی قوتِ کار اور ان کی منفعت مرد سے بہت کم ہے"۔ یہاں "انقص" اور "اقل" کے الفاظ نہایت قابلِ غور ہیں۔ (مرتب)

لیے کہ شُبہ موجود تھا کہ انسان چاہے چوری کسی شکل میں کر رہا ہو لیکن ہو سکتا ہے اور ظنِ غالب ہے کہ بھوک اس کا اصل سبب بن گیا ہو — تو کہاں ایک پیٹ بھرے انسان کا چوری کرنا اور کہاں ایک بھوکے انسان کا چوری کرنا! اسی پہ قیاس کیجیے کہ کہاں ایک شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! اور کہاں ایک غیر شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! کیا عقل اس کو برابر تسلیم کر سکتی ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اُن لوگوں کی عقل پر آنسو بہاییے اور ان کے حق میں دعا کیجیے جو ان دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بڑے RATIONALIST ہونے کے مدعی ہیں۔ بڑے عقل پسند اور عقل پرست ہونے کے دعویدار ہیں۔

یہی معاملہ قصاص اور دیت کا ہے کہ اس مسئلہ میں خلط مبحث کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا کی جو دیت ہے وہ جان کی قیمت ہے ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ قتل عمد میں آتا ہے اور وہاں بھی اصل الاصول یہ ہے کہ جان کی قیمت جان ہے پیسہ نہیں ہے قاتل کی جان تو مقتول کے ورثا کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اب قاتل کی جان ان کے رحم و کرم پر ہے۔ اب وہ چاہیں تو اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں چاہیں تو قاتل کی جان کا معاوضہ قبول کر لیں۔

> گویا قتل عمد کی دیت دے کر قاتل اپنی جان بچاتا ہے وہ مقتول کی جان کا معاوضہ نہیں ہے اس لیے کہ مقتول کی جان کے بدلے تو قاتل کی جان حاضر ہے۔

البتہ قتل خطاء میں جان کی قیمت کا معاملہ نہیں ہے وہ کسی حد تک اس نقصان کی تلافی ہے جو مقتول کے خاندان کو پہنچا ہے — اس میں یقیناً عورت کی دیت مرد کے مقابلے نصف ہے اور وہ اس ذمہ داری اور اسلام کے فلسفہ عمرانیات کے اعتبار سے ہے کہ مرد EARNING ہے۔ عورت نہیں ہے کسی خاندان کے مرد کا خطاء سے کسی کے ہاتھوں یا کسی کی بے احتیاطی سے ہلاک ہو جانا زیادہ بڑا نقصان ہے بمقابلہ عورت کے — یہ عقلی بنیاد بھی موجود ہے جس کے باعث شریعت میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات اور بھی عرض کر دوں۔ اگر عقل حاکم ہو جائے گی نقل پر۔

تو یہ اسلام کے خلاف راستہ ہے۔ اسلام اصلاً عقل پر نہیں بلکہ نقل پر قائم ہے۔ یہ نقل ہے وحی۔ اللہ کی جانب سے بذریعہ جبرئیل امین علیہ السلام منقول کی گئی ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ قرآن بھی منقول ہے، یہ بھی ایک روایت ہے اس کے راوی اوّل کون ہیں! جبرئیل امینؑ اور راوی دوم کون ہیں! جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پھر یہ روایت چلی آرہی ہے، نبی اکرمؐ نے یہ قرآن صحابہ کرام کو دیا۔ صحابہ سے تابعین کو ملا۔ ان سے تبع تابعینؒ نے لیا اور اسطرح نسلاً بعد نسلٍ قرآن مجید روایت اور نقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا اور اسی طرح یہ نقل ہوتا چلا جارہا ہے۔ یہ قرآن نقل ہے۔ اس کی اساس عقل پر نہیں ہے۔ ہاں جب آپ عقل کو اس کے تابع رکھ کر اس سے کام لیں گے تو یہ بہت شے ہے، بڑی مفید شے ہے، بڑی طاقت ور شے ہے۔ یہ عقل آپ کو اس نقل پر مطمئن کرے گی۔ اس بات کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

قرآن مجید میں بھی بار بار دعوت ہے کہ قرآن کو پڑھو، اس پر غور و تدبّر کرو، اس کے فہم کے لیے عقل سے کام لو۔ متعدّد آیات میں سے دو کے حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۃ الروم میں فرمایا وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ سورہ یٰسٓ میں ارشاد ہوا: وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قرآن جو اصلاً نقل ہے اس کے لیے عقل کلید اور دلیل کا کام دے سکتی ہے لیکن مجرد عقل معرفتِ الٰہی اور شریعت کے حِکَم اور رموز صحیح فہم و ادراک کے لیے ہرگز کفایت نہیں کرے گی۔ اس کو بھی علامہ اقبال نے خوب ادا کیا ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

لیکن۔ یہاں یہ لیکن نہایت قابلِ غور ہے IT IS A VERY BIG BUT لیکن اگر آپ نے اس نقل یعنی قرآن پر عقل کو حاکم بنا دیا تو جان لیجیے کہ چاہے آپ کہتے رہیں کہ آپ قرآن کو مانتے ہیں۔ درحقیقت آپ قرآن کو نہیں اپنی عقل

(بقیہ ص۸۸ پر)

جامعہ بابُ العلوم، کہروڑ پکا ضلع ملتان کے

مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی

کا

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے

براہِ راست اور بواسطہ ماہنامہ 'الخیر' ملتان

استفسار

اور اُس کا

جواب!

(۱)

جناب ملکانوی کا پہلا خط ـــــ محررہ ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ

امامُ الہند بنانے کی تجویز ـــ استاذ العلماء شیخ الہند کا کردار

شیخ الہند کے جانشینوں کو دعوتِ فکر اور ایک سوال!

ڈاکٹر اسرار احمد کے حضور عرضِ نیاز!

میثاق بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون "مولانا ابوالکلام، جمعیت العلماء ہند اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن" شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز اور استاذ العلماء حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ساتھ موصوف کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا منہ بھر کر واشگاف الفاظ میں اقرار کیا گیا۔ اور مولانا ابوالکلام کی دعوت کے بنیادی عنصر (قرآن و جہاد) کی بھی نشاندہی فرمادی گئی جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشیوخ مولانا محمود الحسن دیوبندی ایسی عظیم نابغۂ روزگار شخصیت کو

مسحور کر دیا تھا اور استاذ العلماء باین علم و فضل، تقویٰ و تدین و خلوص و للّٰہیت برملا فرمایا کرتے تھے کہ اس نوجوان (ابو الکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور یہ سب کچھ تقلید کے گڑھ ہندوستان میں ہو رہا تھا جہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں اور اس تمام کارروائی کے خالق حضرت شیخ الہند پکّے کٹّر حنفی ہیں اور جس عبقری نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامتِ ہند کا تاج رکھنا چاہتے ہیں وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم بامسمّٰی آزاد ہیں۔ حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور، ایک آزاد خیال انسان نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت نہ جبّہ و عمامہ نہ عبا و قبا نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث۔ لیکن بایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہرِ قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں امام الہند مان لینے کی تجویز کے پُر زور مؤید بھی۔

الحاصل ان تمہیدی گذارشات کے بعد جنہیں دراصل ڈاکٹر صاحب کے فرمودات و ارشادات کا خلاصہ کہنا بے جا نہ ہوگا، یہ بات روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور تجدیدِ احیائے دین و تجدیدِ ملّت کی منزل کو قریب تر کرنے کے لئے۔ ماہ و سال، اعلیٰ و ادنیٰ، قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تحریک احیائے دین کے مؤسس ابو الکلام آزاد کو امام الہند تجویز کرانے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں تو کیا آج بھی اگر کوئی شخص جو کہ معروف طریقہ کا سکّہ بند اور مسلّم عالمِ دین نہ ہو اور نہ ہی حنفیت کی جلی چھاپ رکھتا ہو۔ لیکن بایں ہمہ امتِ مسلمہ کو انحطاط و زوال اور نکبت و فلاکت سے نکالنے کے لئے اعتصام بالقرآن اور دعوت رجوع الی القرآن کا محض خیالی داعی اور ڈھنڈورچی ہی نہیں بلکہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ٭ یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

کا مصداق ہو۔ تو کیا ان حالات میں استاد العلماء شیخ الہند کے ارادت مند عقیدت کیش جانشینوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اپنے شیخ کی طرح وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں دوسری مثال قائم کر دیں گے۔ اور کسی ایسی نابغۂ روزگار ہستی کی امامت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے فھل من مستمع وھل من مجیب یا پھر سکّہ بند حنفیت زہد و تقویٰ کی اجارہ داری یا روایتی و مدرسی علم کا ادّعا آڑے آئے گا؟ بہرحال امیرِ تنظیم اسلامی کی طرف سے شیخ الہند کے جانشینوں کو یہ ایک دعوتِ فکر ہے چاہئے وہ اتباعِ شیخ میں وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا بھرپور مظاہرہ کریں یا پھر حنفیت کی تقلید جامد اور روایتی و مدرسی علم کا ادّعا نہیں حق بات تسلیم کرنے سے روک دیے امیرِ موصوف کے ارشاد کے مطابق علمائے کرام ہماری ان گذارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں ؎ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا۔

الحاصل امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا بڑے پُر پیچ پُر اسرار اور دبے دبے لفظوں میں شیخ الہند کے جانشینوں سے یہ ایک مطالبہ ہے۔ نہ معلوم اس خیر سگالی مطالبہ کا ان کی طرف سے کس وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی سے جواب دیا جاتا ہے۔ یہ ان حضرات کا نجی معاملہ ہے جس سے سردست ہمیں سروکار نہیں۔

القصہ مذکورہ بالا مقدمات کو جب ترتیب دیا جائے تو بنیادی طور پر چند خدشات سوالیہ پیدا ہوتے ہیں۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق شفاء العی سوال خیال گذرا کہ کیوں نہ ہو امیر تنظیم اسلامی ہی کے حضور اپنے اندیشہائے ذہنی کو عرض کرتا چلوں۔ اگرچہ آج سے پہلے خاکسار کو امیرِ محترم سے نیازِ مکاتبت کا شرف حاصل نہیں۔ تاہم اخوتِ اسلامی کے تعلق سے پُر اُمید ہوں کہ آنجناب محروم نہ فرمائیں گے۔

۱۔ اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل وعقد قومی وملی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت وامارت پر اتفاق کرلیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ امت کی دستگیری اور ملک وملت کی فلاح وبہبود کے پیشِ نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جارہا ہے اس کے طائرِ دماغ میں معمولی طلب تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک کے انکار کا معاملہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بے طلب و مدعا امور امت سپرد کئے جائیں تو باعثِ خیر وبرکت ہوتے ہیں اور طالب منصب و مراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ یا پھر فلاح وسعادت اور نصرتِ خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "اے عبدالرحمٰن امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کر دی جائے گی (امدادِ خداوندی نہ ہوگی) اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری (منجانب اللہ) مدد کی جائے گی۔

۲۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ میرے دو چچازاد بھائی تھے۔ ان میں سے ایک بولا یارسول اللہ جو ملک اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دیئے ہیں ان میں سے کسی ملک کی حکومت ہمیں دیدیجئے، اور دوسرے نے بھی یہی کہا۔ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم ہم کسی کو اس امر کا حاکم نہیں بناتے جو اس حکومت کی درخواست کرے اور نہ اس کو جو اس کی حرص کرے۔

۳۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپؐ مجھے عامل نہیں بناتے۔ آپ علیہ السلام نے اپنا دستِ مبارک میرے کندھے پر مارا اور فرمایا

ابو ذر تو کمزور ہے اور یہ امانت ہے قیامت کے دن سوائے رسوائی اور شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہے مگر جو اس کے حقوق ادا کرے اور جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہیں انہیں پورا کرے۔

۲ے ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کی حد تک تھی جس کے لئے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول و فعل کو بطور حجت و دلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا اور نہ ہی مذہبی قیادت و سیادت کی دستار ان کے سر پر رکھ دی گئی تھی۔ جبکہ زمانہ حال کی امارت گروہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

۳ے مولانا ابوالکلام کے لئے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوز و مؤید اس وقت کے خیار امت زہد و تقویٰ۔ اخلاص و للّٰہیت۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ کی امارت کے مجوز و مؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں۔ دیدہ باید۔

جناب والا! آپ کے حضور زندگی کی پہلی نیاز ہے بعرض احوال کے آداب سے بالکلیہ نابلد ہوں۔ اگر طبع نازک پر انجان سائل کی خش خش گراں نہ گزرے تو میثاق میں جواب کا منتظر رہوں گا۔ والسلام: خاکسار بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

---

(۲)

جناب ملکانوی کا دوسرا خط ـــــ محررہ ۲۰ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ

بخدمت گرامی قدر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد اللہ شرفکم العالی!

درخواست دعا کے بعد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج محترم بعافیت راضی تمام ہوں گے۔ المرام آنکہ چند ماہ پیشتر ناچیز نے خدمتِ عالیہ میں ایک سوالیہ نیاز نامہ رجسٹری کیا تھا جس کا جواب باوجود طلب کے میثاق میں نہ آیا نہ آنا تھا۔ اور ویسے بھی حقائق کے جواب صبح قیامت تک بن نہیں پڑتے۔ اس لئے یہ بات نہ کوئی باعثِ تعجب تھی نہ اب ہے۔

البتہ حیرانی تو جناب قمر سعید صاحب کی بے تابی پر ہے کہ موصوف مجھ خاکسار کے کوائف جمع کرنے کے لئے شہر کی ایک عظیم المرتبت علمی شخصیت کو خط میں لکھتے ہیں کہ "ہمیں بعض ضروری امور کی خاطر جناب ایاز ملکانوی صاحب کے کوائف کی ضرورت ہے۔ براہِ کرم آپ حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے کوائف وغیرہ حاصل کر کے ہمیں ارسال فرمادیں۔ ہم شکر گزار ہوں گے۔ آپ کا ہم سے یہ تعاون ایک دینی معاملہ ہی کے لئے مطلوب ہے۔"

گرامی قدر! نہ معلوم یہ کونسی حکمت قرآنی ہے اور دعوت رجوع الی القرآن کا اصول و

ضابطہ ہے کہ سائل کے سوال کا جواب تب دیا جائے جب اس کے مکمل کوائف معلوم ہوں۔ جناب آپ کے پروگرام اور شبانہ روز سعی و محنت کا بنیادی نقطہ دعوت رجوع الی القرآن ہے تو کیا آپ کا یہ عمل اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الآیۃ) کا مصداق ہونے کے ساتھ ساتھ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الآیۃ) کی ہدایتِ ربّانی کے بھی سراسر خلاف ہے ؎

آنکہ پیش تو گفتم غم دل ترسیدم! — کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اچھا خیر یہ ایک نیازمندانہ شکوہ تھا۔ امید ہے طبعِ نازک پہ گراں نہیں گزرے گا۔

عالی قدر۔ محرومی جواب کے باوجود بقول حضرت غالبؔ ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی!

آج پھر مختصر عرض نامہ لے کر حاضرِ خدمت ہوں۔ کاش ؎

چھیڑنے کا مزہ تو تب ہے کہو اور سنو — بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

کرمفرمائے محترم! نزول وحی کی اوّل تاریخ بعض حضرات نے ۲۸ رجولائی ۶۱۰ء بروز شنبہ شب قدر بیان فرمائی ہے جبکہ ماہنامہ حکمتِ قرآن جمادی الاخری ۱۴۰۴ھ میں مولانا عبدالکریم پاریکھ نے مقالہ "قرآن مجید۔ قرآن کی روشنی میں" نزولِ قرآن عیسوی ۶۱۰ء اگست کی کچھ تاریخ کو بتایا ہے۔

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن شمارِ حضرت عائشہ رضہ کے مطابق ۶۶۶۶ ہیں۔ اور مولانا دریا بادی نے ۶۶۱۶ کو میزان اصح قرار دیا ہے جبکہ حکمت قرآن کے مقالہ نگار نے ۶۲۳۷ آیات شمار فرمائی ہیں۔

بہرحال ان ہر دو باتوں میں توفیق مطلوب ہے۔ رہی بات میرے کوائف کی تو وہ حضرت اصغرؔ سے سن لیجئے ؎

تیرا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے — مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

میں ہوں وہ مست جس کا ایک جرعہ زمزم و کوثر!!
میں اس تکوین کے خمخانہ میں صہبائے وحدت ہوں

اجازت! طالب جواب — والسلام

بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

(۳)

ماہنامہ "الخیر" شمارہ جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ تحریر!

"میثاق" بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون

مولانا ابوالکلام، جمعیۃ العلماء ہند اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ" شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز پر استاذ العلماء حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ان کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی مدح و توصیف کی گئی ہے اور حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ کے علم و فضل تقویٰ و تدین اور خلوص و للٰہیت کے اعتراف و اقرار کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد مرحوم پر آپؒ کی عنایات اور بیحد اعتماد اور حسنِ سلوک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ صاحبِ مضمون کے مطابق حضرت شیخ الہند جس عبقری، نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامت ہند کا تاج رکھنا چاہتے تھے۔ وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم بامسمّٰی آزاد تھے۔ حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور، ایک آزاد خیال انسان، نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت، نہ جبہ نہ عمامہ، نہ عبا نہ قبا نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث لیکن بایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہرِ قابل کے قائل بھی ہیں اور ان کو امام الہند مان لینے کی تجویز کے پُرزور مؤید بلکہ داعی بھی۔

حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومت الٰہیہ اور تحریک احیائے دین و تجدید ملّت کی منزل کو قریب تر لانے کے لیے قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس استقامت و بلند حوصلگی سے تحریک کی قیادت فرمائی اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والے تمام اعلیٰ و ادنیٰ حضرات کو بلا امتیاز جس محبت و بندہ پروری سے نوازا مولانا آزاد پر یہ عنایت بھی انہی مراحم خسروانہ کا ایک حصہ ہے۔

مگر ڈاکٹر اسرار احمد اس سے کچھ اور مفہوم اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق شیخ الہندؒ کے ارادت مند، عقیدت کیش جانشینوں کو اپنے شیخ کی طرح وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں ایک دوسری مثال قائم کرنی چاہیے اور "سکہ بند حنفیت" زہد و تقویٰ کی اجارہ داری اور روایتی و مدرسی علم کا ادعا آڑے نہیں آنا چاہیے۔

آج شیخ الہندؒ کے جانشین اتباعِ شیخؒ میں کس کو "امیر الپاکستان" تسلیم کریں۔ اس کی وضاحت امیرِ تنظیم اسلامی نے نہیں فرمائی مگر ان کے پُرپیچ، پُراسرار اور دبے دبے لفظوں میں جس شخصیت کے بارے میں وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی اختیار کئے جانے کا مطالبہ جھلک رہا ہے وہ چشم بد دور "حضرت اقدس ڈاکٹر صاحب" ہی کی ذاتِ گرامی قدر معلوم ہوئی ہے۔ مگر غالباً انہوں نے از راہِ کسرِ نفسی اپنے نام کی صراحت نہیں فرمائی۔ باقی

ع یہی کہتے ہیں وہ اور کیا کہنے کو ہیں

اور —— ع ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

اس بات سے قطع نظر کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے اور مولانا

آزاد اور اپنے درمیان عدم تفاوت ظاہر کرنے کے لئے جس رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے وہ درست ہے یا نہیں ؟ ——— اور بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے مرتکب، حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور آزاد خیال انسان، سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت سے محروم جُبّہ و عمامہ اور عبا و قبا سے تہی دامن اور مفتی و شیخ الحدیث کے منصب سے خالی جیسے الفاظ سے وہ مولانا آزاد کا تعارف کروا رہے ہیں یا اپنی شخصیت کا نقشہ کھینچ رہے ہیں ؟

ڈاکٹر صاحب کے حُسنِ طلب کی داد نہ دینا تنگ ظرفی ہوگی مگر یہ طلب کچھ غور طلب ہے۔

کیا ڈاکٹر صاحب ہمارے طالب علمانہ ایک دو اشکالات کا جواب دینا پسند فرمائیں گے ؟

(۱) اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل و عقد، قومی و ملّی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت و امارت پر اتفاق کرلیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ امّت کی دستگیری اور ملک و ملّت کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جارہا ہے اس کے طائرِ دل و دماغ میں معمولی تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک انکار کا معاملہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بے طلب و مدعا امّت سپرد کئے جائیں تو باعث خیر و برکت ہوتے ہیں اور طالب منصب و مراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کردیئے جاتے ہیں یا پھر فلاح و سعادت اور نصرت خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، اے عبدالرحمٰن امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کردی جائے گی (امدادِ خداوندی نہ ہوگی)۔ اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری منجانب اللہ مدد کی جائے گی۔

(۲) ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریّت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کی حد تک تھی۔ جس کے لئے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول و فعل کو بطور حجت و دلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا۔ اور نہ ہی مذہبی قیادت و سیادت کی دستار ان کی سر پر رکھ دی گئی تھی جبکہ زمانۂ حال کی امارت گروہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

(۳) مولانا ابوالکلام کے لئے امامت ہند کے رفیع منصب کے مجوّز و مؤیّد اس وقت کے خیار امّت زہد و تقویٰ اخلاص و للّٰہیت علم و عمل میں یکتائے روزگار تھے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ اُن موصوف کی امارت کے مجوّز و مؤیّد کون اور کس معیار کے لوگ ہیں۔

(۴)۔ ڈاکٹر صاحب کا جواب اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

مکرمی و محترمی مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب !

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ـــــ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا پہلا والا نامہ میرے نام اغلباً مارچ ۸۴ء میں موصول ہوا تھا۔ میری خط و کتابت کا سلسلہ عرصہ سے بالکل بند ہے اور اکثر خطوط کے جوابات میرے رفقائے کار ہی دیتے ہیں (اس کے متعدد اسباب ہیں جن کے ذکر کی اس موقع پر چنداں ضرورت نہیں ہے) لیکن آپ کے خط کے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر میں خود ہی اس کا جواب تحریر کرنا چاہتا تھا۔ (بلکہ میری خواہش تو اور ہی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا!) ـــ ادھر اپریل ۸۴ء سے میرے بیرونِ ملک دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اپریل میں ہندوستان اور مئی میں سعودی عرب کے طویل دورے ہوئے ـــ جون میں رمضان المبارک میں اس سال اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو نمازِ تراویح کے ساتھ پورے قرآن مجید کے ترجمہ کا دورہ مکمل کیا ـــ جولائی مکمل اور نصف اگست امریکہ اور برطانیہ کے دورے کی نذر ہو گئے۔ واپس آیا تو اندرونِ ملک دوروں کے قرض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ اور گذشتہ دو ہفتوں سے علیل اور صاحب فراش ہوں۔

ادھر میری اصل خواہش آپ کو خود جواب تحریر کرنے سے بھی زیادہ یہ تھی کہ ایسے اہم موضوع پر خط و کتابت کی بجائے بالمشافہ ملاقات کی شکل نکال کر تفصیلی گفتگو کی جائے! اسی غرض سے میں نے بعض ذرائع سے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیں تھی کہ اگر آپ کوئی معمر بزرگ ہوں تو میں خود حاضرِ خدمت ہونے کی سبیل نکالوں ـــ اور اگر نوجوان علماء میں سے ہوں تو آپ کو لاہور آنے کی دعوت دوں۔ اس کا آپ نے جس قدر بُرا منایا اس سے حیرت ہوئی ـــ تاہم آپ کے دوسرے خط کے اسلوبِ نگارش سے میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں نوعمری کا لاابالیانہ پن ـــ اور اٹھتی ہوئی جوانی کا متحدیانہ انداز آپ کی عمر کی غمازی کر رہا ہے ـــ آپ کے اس دوسرے خط کا ایک "ترکی بہ ترکی" قسم کا جواب بھی تنظیم کے دفتر والوں نے تیار کر لیا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا ـــ اس لئے کہ میں خود ہی کچھ معروضات پیش کرنے کی خواہش رکھتا تھا ـــ اس اثناء میں معاصر ماہنامہ "الخیر" میں آپ کا کھلا استفسار نظر سے گزرا جس میں آپ نے اپنے پہلے خط کی تلخیص اپنے دوسرے خط کے طنزیہ انداز میں نگارش کی ہے ـــ بہرحال اب میں حاضرِ خدمت ہوں۔ تاخیر کے لئے معذرت کے ساتھ!

آپ نے بعض احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میری ہدایت و رہنمائی کے لئے درج فرمائی ہیں جن کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ (اگرچہ ان کے محل و موقع کے ساتھ عدم مناسبت کے ضمن میں بعد میں کچھ عرض کروں گا!) اور خود بھی آپ کی خدمت میں ایک حدیث نبوی کا تحفہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یعنی "لیس المؤمن بالطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی" (ترمذی) امید ہے کہ آپ اس پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ سے متعلق میری تحریر کا تعلق ہے، اصل تحریر سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ نہ اس موضوع پر کچھ لکھنا میرے پیش نظر تھا اور نہ ہی وہ واقعات جن کا میں نے ذکر کیا ہے، خود میرے علم میں پہلے سے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زندگی کے 'الہلال' اور 'البلاغ' والے دور سے اصولاً مجھے تعلق خاطر ہے اور اس کے تذکرے میں ایک بات میرے قلم سے وہ نکل گئی جو مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ جس کی شدت کے ساتھ تردید ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب نے کی۔ چنانچہ مجھے تحقیق و تفتیش میں سرگرداں ہونا پڑا جس کی پوری تفصیل میرے اس مضمون میں درج ہے ـــــ اس تحقیق و تفتیش کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے جو پہلو میری نگاہوں کے سامنے آئے وہ اس سے قبل خود میرے علم میں بھی نہ تھے۔ حالانکہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے ترجمۂ قرآن مع حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے استفادہ کرتا رہا ہوں اور اس وجہ سے مجھے ان دونوں بزرگوں سے ایک گونہ تعلق خاطر حاصل تھا ـــــ میری تحریر کا اصل محرک تو وہ تحریر خود بول رہی ہے کہ وہ شدت تاثر تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کی عظمت کے انکشاف سے مجھ پر ہوا جس کی بنا پر میری یہ حتمی رائے بنی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے ـــــ ساتھ ہی یہ احساس بھی ابھرا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت سے خود حلقۂ دیوبند کے علماء اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کی اکثریت پوری طرح واقف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کی بعض دوسری معاصر شخصیتوں کا چرچا ان کے مقابلے میں زیادہ ہے! (واضح رہے کہ میرا نوجوانی کے دور ہی سے حلقۂ دیوبند کے علماء سے رابطہ رہا ہے۔ جن دنوں میں سابوال

میں مقیم تھا تو جامعہ رشیدیہ اور اس سے وابستہ علمائے کرام سے شرف ملاقات حاصل ہوتا رہتا تھا۔ کراچی میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کا بارہا اتفاق ہوا! ـــــ اور لاہور میں جامعہ مدنیہ اور بالخصوص مولانا سید حامد میاں مدظلہ کی خدمت میں بحمداللہ میری مسلسل حاضری رہتی ہے۔ اور ان کے سامنے جب میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ بھی چونک سے گئے اور ان کا ردِّعمل تائیدی رنگ لئے ہوئے تھا۔! اس تحریر کی دوبارہ اشاعت کا اصل محرک یہی خیال تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت سے لوگوں کو از سرِ نو متعارف کرایا جائے۔!

البتہ اس کے بین السطور میں آپ نے میری جس "نیت" یا "خواہش" کا سراغ لگایا ہے، میں اس کی بالکلیہ نہ تردید کرتا ہوں نہ توثیق ـــــ من وجہ اقرار ہے ـــــ اور ـــــ من وجہ انکار!

ایک شاعر کے قول "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں" کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے، اور جس کے لئے میں نے اپنے پیشۂ طب کو بھی خیرباد کہا ہے، وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زوردار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ـــــ اور جس کے لئے انہوں نے عملی جدّوجہد کا آغاز بھی "حزب اللہ" کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے ـــــ مجھے حیرت ہے کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی نہیں، حضرت شیخ الہندؒ کی مساعی کا اصل ہدفِ اوّلین بھی صرف اور صرف جہادِ حریّت اور تحریکِ استخلاصِ وطن" کو قرار دے رہے ہیں اور "حزب اللہ کی تاسیس اور حکومتِ الٰہیّہ کا قیام عمل میں لانا" آپ کے نزدیک اس اصل مقصد کا ذریعہ تھا ـــــ مجھے یقین ہے کہ 'الخیر' والے مضمون میں یہ جملے آپ کے قلم سے سہواً نکل گئے ہیں ورنہ یہ حقیقت آپ پر یقیناً منکشف ہوگی کہ جس طرح پچھلی صدی کی دو عظیم تحریکوں میں سے اوّلین یعنی تحریکِ شہیدینؒ خالصتہً مسلمانوں کی تحریک تھی اور اس کا اصل مقصد تھا 'اعلائے کلمۃ الحق اور قیامِ حکومتِ الٰہیّہ و نظامِ شرعیہ' اور اس کے ذریعے

کے طور پر پیشِ نظر تھا استخلاصِ وطن، جبکہ دوسری تحریک یعنی ۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی (انگریزوں کے قول کے مطابق 'غدر') ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تحریک تھی۔ اور اس کا اصل مقصد تھا حصولِ آزادی ــــ البتہ اس میں جن علمائے کرام نے حصہ لیا ان کے پیشِ نظر یقیناً مقدم الذکر مقصد بھی تھا ــــ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے دَورِ اوّل کا اصل مقصد تھا 'رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ برائے اقامتِ دین اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور اس کے لئے انہوں نے بالفعل آغاز کر دیا تھا 'حزب اللہ' کی تاسیس سے ــــ جبکہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ان کی مساعی بالفعل کلّیتہً مرتکز ہوگئیں "صرف اور صرف جہادِ حرّیت اور استخلاصِ وطن" کے لئے! ــــ حضرت شیخ الہندؒ کے جہادِ زندگی کا اصل تعلق ہے 'تحریکِ شہیدینؒ' سے اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی جدوجہد میں زیادہ رنگ غالب نظر آتا ہے "جہادِ حرّیت اور استخلاصِ وطن کا' ــــ اور یہی وجہ ہے کہ 'الہلال' اور 'البلاغ' والے ابوالکلام کے بارے میں ان کی زبان سے وہ تاریخی جملہ نکلا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!" ــــ اس ضمن میں ایک واقعہ اور بھی سن لیں جو حال ہی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلّہ نے (جو اس وقت شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند (بھارت) کے ڈائرکٹر ہیں) سنایا کہ جب کانپور کی مسجد کے واقعہ پر صورتِ حال بہت نازک ہوگئی تھی اور کشیدہ بھی اور اس سلسلہ میں نہایت تیز و تند مضامین لکھے تھے مولانا آزاد مرحوم نے ـ تو صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے یوپی کے لفٹیننٹ گورنر نے دیوبند کا دورہ رکھا اور دارالعلوم میں آمد کا پروگرام بھی بنایا لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام موجود نہ ہوں ــــ چنانچہ اس وقت کے مہتمم صاحب نے مولانا آزاد کے دارالعلوم میں داخلے پر پابندی لگا دی تو حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس جلسے کا بائیکاٹ کیا اور اس میں شرکت نہیں فرمائی ـ اور جب کچھ لوگوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "حضرت! آپ ایک نوجوان کا اس درجہ کیوں خیال فرما رہے ہیں؟" تو انہوں نے جواباً یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

خدارا! حقائق و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں ــــ اور خود اپنے حلقے کی ایک عظیم شخصیت کی زندگی کے ایک دور (اور وہ بھی آخری دور) کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اہم باب پر جو پردۂ خِفا پڑ گیا ہے (یا جان بوجھ کر ڈال دیا گیا ہے!) اسے اٹھا کر اصل حقیقت کو دیکھنے کی سعی کریں ـــــ بہر حال میرے نزدیک مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے اس انتقالِ موقف سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسی کو پُر کرنے کے لئے اٹھے تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ـــــ چنانچہ یہ محض 'اتفاق' نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی پہلی تصنیف تھی "الجہاد فی الاسلام" ـ جو گویا نہایت بسیط اور مدلل صدائے بازگشت تھی 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوتِ جہاد فی سبیل اللہ کی ـــــ اور مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر اور مولانا مودودی مرحوم کے ماہنامے دونوں کا نام ایک ہی ہے یعنی "ترجمان القرآن"

مولانا مودودی مرحوم کے بعض نظریات سے شدید اختلاف کے باوجود میری رائے ہے کہ انہوں نے اصلاً اس دعوت کے تسلسل کو قائم رکھا جس کے داعیٔ اول مولانا آزاد تھے ـــــ اور اس سلسلے میں یقیناً قابلِ لحاظ پیش رفت بھی کی لیکن افسوس کہ جس طرح ان کے پیش رَو اپنے رُخ کی تبدیلی کے بعد کلیتہً وقف ہو کر رہ گئے تھے "ہندوستان کی قومی سیاست" کے ـــــ اسی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی آزادیٔ ہند اور قیام پاکستان کے بعد 'پاکستانی قومی سیاست' کی نذر ہو گئے ـــــ اور اس طرح خالص اقامتِ دین وغلبۂ دین کی جدوجہد اور اسلام کی انقلابی دعوت کا تسلسل پھر ٹوٹ کر رہ گیا ـــــ چنانچہ اسی کے احیاء کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزمِ مصمم کیا ہے ان سطور کے حقیر و

حاشیہ ص ۶۴

لے مولانا سعید الرحمٰن علوی سابق مدیر 'خدام الدین' نے اپنے ایک مقالہ (شائع شدہ 'میثاق' اکتوبر ۸۳) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ "شیخ الہندؒ نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماء ہند کے دوسرے جلسہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا۔ بقول مولانا محمد میاں "بیماری ونقاہت کے سبب تھوڑی دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا" لیکن اس اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے "میری چارپائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے. اور یہ کام کر لیا جائے۔ پہلا شخص جو بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا" (مولانا علوی نے یہ واقعہ تاریخِ امت ص۵۲ کے حوالے سے لکھا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پیش نظر امیر الہند یا امام الہند کے لئے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم ہی کا نام تھا اور تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ حضرتؒ کے ایماء پر اس تجویز کے مفتی کفایت اللہؒ مجوز اور مولانا احمد سعیدؒ مؤید تھے (ج۔ر)

عاجز راقم نے ــــ اور اس کام میں وہ اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے جملہ علمائے دین، بالخصوص حلقۂ دیوبند کے وابستگان کی اعانت اور سرپرستی کا ــــ چنانچہ یہ ہے میری اصل خواہش یا تمنا جسے آپ نے میری تحریر کے بین السطور پڑھا ہے، اور اس حد تک میں 'اقراری مجرم' ہوں. ــــ لیکن اگر آپ اسے تعبیر کرتے ہیں "امام الباکستان" بننے کی خواہش اور منصب کی تمنا سے تو یہ میرے نزدیک ع "جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے" کے مصداق خالصتہً آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق و اختراع ہے جس سے میں اظہار برأت کرتا ہوں اور آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ " اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" کی قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھیں اور اس سوءِ ظن سے اجتناب فرمائیں۔

الحمد للہ کہ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ میں کسی خطۂ زمین میں دعوتِ اسلامی کے آغاز سے اقامت و غلبۂ دین کی آخری منزل تک کے جملہ مراحل یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا واقعہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ہوا ہے ــــ یعنی سید الاولین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ــــ اور آپ ہی کے مقصدِ بعثت کی آخری تکمیل بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (ازالۃ الخفا) کے طور پر یہ کام ایک بار پھر ہوگا ــــ اور عالمی سطح پر ہوگا۔ لیکن اس کے لئے آپؐ کے غلاموں کو کئی نسلوں تک مسلسل جدّ و جہد کرنی ہوگی اور ایک ایک نسل کے دوران اس عمل کو ایک ایک درجہ آگے بڑھا دینا بھی امت کے لئے بہت بڑی کامیابی ہوگی اور جو خوش قسمت افراد اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان کے لئے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ اور اس ضمن میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوصف جو خدمت انجام دی تھی مولانا آزاد نے۔ اسی کے چراغ سے روشن ہوا جماعتِ اسلامی کا دیا ــــ اور اب اس کی بھی ناکامی کے بعد ان شاء اللہ اسی کی خاکستر سے نئی چنگاریاں روشن ہوں گی اور میں اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود 'خواہشمند' ہوں ؎

احب الصالحین ولست منھم ۔۔۔ لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

کے مصداق اسی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کا ــــ لیکن ہرگز مبتلا نہیں ہوں اس خبط و حماقت میں کہ یہ عظیم کام میری 'امامت' میں سرانجام پائے گا اور میں نہ صرف یہ کہ مجددین کی فہرست میں جگہ پا جاؤں گا بلکہ بقول مولانا مودودی "مجدد کامل" کے مقام پر فائز ہو جاؤں گا!

ـــــ اس ضمن میں، میں درخواست کروں گا کہ آپ میری ایک تالیف "سرِ انگندیم" کا مقدمہ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اس ضمن میں آپ نے جن احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا حوالہ دیا ہے اُن میں آپ سے نادانستہ ایک شدید خلطِ مبحث ہو گیا ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ کیا حکومت کے مناصب کی طلب یا خواہش اور دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لئے پیش قدمی ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ آپ کے استدلال کا غلط نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص کسی حال میں بھی دین کی خدمت کا داعیہ لے کر نہ اٹھے، اس لئے کہ لامحالہ اس سلسلہ میں جو شخص بھی پہل کرے گا اور دوسروں کو "مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ" کی ندا دے گا، وہ فطری طور پر خود اس صدا پر لبیک کہنے والوں کا سربراہ یا رہنما یا امیر بن جائے گا اور یہ چیز چونکہ ناپسندیدہ ہے لہٰذا لازم ہے کہ سب بیٹھے رہیں اور صورتِ حال کو دن بدن بگڑتے دیکھیں اور خاموش رہیں۔ ـــــ گویا ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا!

مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے طرزِ استدلال کے اس منطقی نتیجے کو پسند نہیں فرمائیں گے۔

ـــــ اور بفرضِ محال اگر آپ کا خیال وہی ہے تو سب سے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ قریب ترین ماضی کی خالص ترین اسلامی تحریک کے داعی و مجاہدِ کبیر حضرت سیّد احمد بریلویؒ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے!! ـــــ کیا انہیں وقت کے "اربابِ حل وعقد" نے "منصبِ امامت" پر فائز کر دیا تھا یا انہوں نے خود اپنی بیعت کی دعوت لوگوں کو دی تھی؟

آپ کے "معاصر" الخیر کے آخری اور حددرجہ تیکھے سوال یعنی "مولانا ابوالکلام کے لیے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوّز و مؤیّد اس وقت کے خیارِ امّت زہد و تقویٰ، اخلاص وللّٰہیت میں یکتائے روزگار تھے لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ 'موصوف کی امارت کے مجوّز و مؤیّد کون اور کس معیار کے لوگ ہیں؟" (ص۴۶) کا اسی قدر تیکھا اور الزامی جواب تو یہ بنتا ہے کہ حضرت! مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ بقولِ خود آپ کے "وقت کے خیارِ امت" اور "زہد و تقویٰ، اخلاص وللّٰہیت (اور) علم و عمل میں یکتائے روزگار" حضرات کی تجویز و تائید کا وہ حشر کیوں ہوا؟ ـــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم "نہ خود کچھ کرنا نہ دوسروں کو کرتے دیکھ سکنا" کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہوں؟

اور کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی اس ساری 'جھنجھلاہٹ' کا اصل سبب حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے آئینے میں موجودالوقت علمار کی اکثریت کی تصویر دیکھ لینا ہو!! گویا ؎

" آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!"

لیکن یہ ساری نوک جھونک غیر مفید بلکہ نقصان دہ ہے ۔ اصل اہمیت اس مسئلہ کی ہے کہ ہم غور کریں کہ آیا دین حق اس وقت "الحق یعلوا ولا یعلی کے مصداق غالب و سربلند ہے یا سرنگوں اور پامال ! بقول حالیؔ مرحوم :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے　　امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پھر اگر معاملہ واقعی مغلوبیت اور پامالی کا ہے تو اس صورتِ حال کی تبدیلی کا صحیح نہج کیا ہے ؟ اور کیا اس ضمن میں وہی راہِ عمل درست اور صحیح نہیں ہے جو تجویز کی تھی ۱۲ء تا ۲۰ء مولانا ابوالکلام آزاد نے، اور جس کی کامل تصویب و توثیق فرمائی تھی "استاذ الاساتذہ" (یہ الفاظ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے ہیں) اور 'شیخ الشیوخ' امام الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اس وقت جبکہ ان کی حیاتِ مستعار کا دیا ٹمٹمارہا تھا اور وہ سفر آخرت کے لئے بالکل پا بہ رکاب تھے ! ___ اور اگر اس وقت ان کے ایما کے مطابق ایک قدم اس لئے نہ اٹھایا جاسکا کہ خیر آبادی مکتبِ فکر کے ایک عالمِ دین نے ایک صحیح اور درست لیکن خالص فنّی نوعیت کا اعتراض کر دیا تو کیا اس کے بعد سے آج تک ان کے تلامذہ اور متوسلین میں سے کسی نے خالصۃً اس طریق کار پر جدّ و جہد کا آغاز کیا ؟؟

محترم ! ؏ " ہمت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا !" کے مصداق ذرا کمر ہمت کسیئے اور ان امور پر غور فرمائیے کہ :۔

(۱) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین جس خلیج کو ابتدا ہی میں پاٹ دینے کی کوشش کی تھی حضرتِ شیخ الہندؒ نے، وہ اس کے بعد روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور مسلمانانِ برصغیر کی ملّی اور قومی زندگی کا اصل دھارا علی گڑھ کے زیرِ اثر آتا

چلا گیا ـــ اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹتی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی ـــ تا آنکہ اب وہ اپنے محدود دائرۂ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ جزیرے بھی دن بدن " نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا" کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں؟

(۲) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ طبقۂ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا، اپنے بل بوتے پر کیا ـــ جس کا اصل نقشہ کار بھی ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا ـــ اور اس پر عملی جد و جہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی ـــ ان کے بعد سے برصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماء کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماء ہند کی حیثیت کانگریس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ـــ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماء اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ـــ اور یہی صورتِ حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیوبند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماء کرام اپنی تمام تر جلالتِ شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں یا ایم آر ڈی کا ـــ اور یا پھر جماعت اسلامی کے مانند " نیمے دروں، نیمے بروں" بلکہ صحیح تر الفاظ میں " نہ ادھر نہ اُدھر" کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں (اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبۂ فکر اور اہل حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔

(۳) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علماء کرام جمعہ و جماعت، درس و خطابت، افتاء و ارشاد ایسی اہم خدماتِ جلیلہ اور قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداؤں اور اور دینی علوم کو زندہ رکھنے کے عظیم کارنامے ـــ اور دینِ حق اور شریعتِ حقہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے خلاف مساعی عظیمہ کے باوصف غلبہ و اقامتِ دین کے مثبت مقصد کی جانب کوئی قابلِ لحاظ اور مؤثر اجتماعی تحریک نہیں چلا پا رہے؟ ـــ علماءِ دیوبند کے ایک حلقے سے تبلیغِ دین کے عنوان سے جو عظیم حرکت شروع ہوئی، اس میں شک نہیں کہ وسعت کے اعتبار سے اس کی کوئی نظیر حال میں تو کیا ماضی میں بھی

نہیں ملتی ۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بھی انفرادی اصلاح کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کسی خطۂ ارضی پر دینِ حق کے واقعی قیام و نفاذ کے لئے کوئی "راست اقدام" کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں!

اندریں حالات ـــــ کیا وقت کا اصل تقاضا یہ نہیں ہے کہ :

۱۔ ایک خالص دینی تحریک ـــ خالصتہً غلبہ و اقامتِ دین کے مقصد یا بالفاظِ دیگر "اسلامی انقلاب" کے لئے برپا ہو۔ جس میں علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ دونوں حلقوں کے لوگ شامل ہوں۔ اور یہ تحریک وقتی مسائل و واقعات اور خالص سیاسی حالات کی کروٹوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اصلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین (محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کے اسوۂ مبارکہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور تبعاً ماضیٔ قریب کی خالص اسلامی تحریک "تحریکِ شہیدینؒ" کے طریقِ کار اور تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے ابتداءً "وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا" کے مصداق "الہدیٰ" کی سیفِ قاطع کے ذریعہ الحاد، دہریت، زندقہ اور کفر و شرک کے خلاف جہاد کے لئے پیش قدمی کرے اور وقت آنے پر غلبہ و اقامتِ دین کے لئے "راست اقدام" کرے اور یا اس میں بالفعل کامیاب ہو یا کم از کم "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝" کے مصداق جانوں کا ہدیہ تو بارگاہِ خداوندی میں پیش کر دے۔

۲۔ اس کے لئے تنظیم کی اساس مغرب سے درآمد شدہ اور فی الوقت عمومی طور پر مروّج طریقوں پر نہ ہو بلکہ "بیعتِ سمع و طاعت و ہجرت و جہاد" کی منصوص، مسنون اور ماثور اساس پر ہو۔

اب اگر ایک حقیر و ناتواں انسان نے وقت کے اس تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھا ہی لیا ہے تو کیا علماءِ کرام بالخصوص اس حلقے سے وابستہ حضرات، جو حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں اور مولانا آزاد مرحوم کو بھی کسی نہ کسی درجے میں "اپناتے" ہیں، کا کام یہ ہے کہ اسے طنز و تشنیع کا ہدف بنائیں یا یہ کہ نوجوان اس کا ساتھ دیں ـــ اور بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں؟ ـــ جبکہ

۱۔ اُسے اپنی بے بضاعتی کا پورا اعتراف ہو اور وہ علماء کا حریف ہونا تو درکنار عالم

دین ہونے کا سرے سے مدّعی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو محض قرآنِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور دینِ حق کا ایک ادنیٰ خادم قرار دیتا ہو ۔۔۔

٢۔ اپنے بعض پیش روؤں کی غلطیوں سے تنبّہ حاصل کرتے ہوئے مجتہدِ مطلق ہونے کا ادّعا تو درکنار، فقہیات میں سرے سے دخل ہی نہ دیتا ہو۔

٣۔ سلف صالحین کے اتباع اور "سبیل المؤمنین" کے التزام کو اپنے لئے لازم قرار دیتا ہو ۔۔۔ اور

۴۔ موجود الوقت علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کرتا ہو ۔۔۔ اور اپنے آپ کو اُن کے تعاون اور سرپرستی کا محتاج سمجھتا ہو ۔۔۔ !!

آخر میں طویل سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں ۔۔۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ اور ادارۂ "الخیر" میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ میں اپنی بات کی وضاحت کے لئے علماءِ کرام کی خدمت میں حاضری کو اپنے لئے سعادت خیال کرتا ہوں، اس کا موقع مرحمت فرمائیں تو مزید ممنون ہوں گا۔

فقط

وَالسَّلَامُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

اسرار احمد عفی عنہ، محرم الحرام ۱۳۸۶ھ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ

افکار و آراء

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی تقریر جہاد بالقرآن میثاق کے اگست دستمبر ۸۴ء کے شمارون میں شائع ہوئی تھی۔ موخر الذکر شمارے میں ایک تقریر بعنوان "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" بھی شامل تھی۔ ستمبر کے شمارے میں ان تقاریر پر تبصرہ کرنے اور اپنی آرار اور مشورے ارسال کرنے کی علماء کرام اور اہلِ دانش وبینش سے درخواست کی گئی تھی۔ تا دمِ تحریر اس ضمن میں جو تبصرے اور آرار موصول ہوئی ہیں وہ بے کم وکاست اور ہماری جانب سے کسی تبصرے کے بغیر پیشِ خدمت ہیں۔ (ج ۔ ر) ۔ (۵ر ۱۰ر ۸۴)

مکتوب جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ۔ کراچی

محترم المقام مولانا ڈاکٹر صاحب! زاد فضلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میثاق بابت ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ میں "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریک" والی آپ کی قلمبند تقریر سے استفادہ کا موقع ملا، انشاء اللہ یہ "توضیحِ خدشات" اس نوعیت کے شبہات کے ازالہ میں مؤثر ثابت ہوگی۔ اس شمارے کے اداریہ میں اس خطاب پر تبصرے کی اپیل پڑھ کر خیال آیا کہ بربنائے تعلقِ خاطر جو باتیں قابلِ عرض محسوس ہوئیں گوش گذار کردوں ___ اس سلسلہ میں میری صرف دو معروضات ہیں:

ایک تو یہ کہ اس قسم کے اہم اور نازک موضوعات اگر خود آنجناب کے قلم سے تحریر ہوجایا کریں تو لفظی احتیاط اور پیرایۂ اظہار کی خوبی اور افزوں ہوسکے گی،

دوسرے یہ کہ "انانیت اور عجب" سے اپنی ذات کی برأت کا اظہار محلِ نظر ہے۔ عبدیت کی شان تو یہی ہے کہ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کا اعتراف رہے۔ نجومِ ہدایت حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات میں یہی وصف عیاں ہے۔ "نافق حنظلہ" والا حضرت حنظلہؓ کا اضطراب ہو یا حضرت عمرؓ کا اپنے بارے میں یہ اظہار کہ لیتنی لم اکن شیئا، لیتنی کنت نسیاً منسیاً وغیرہ سب یہی درس فراہم کرتا ہے۔ صوفیاء کرام نے اس حقیقت کو سمجھا۔ اسی لئے ان سے جب پوچھا گیا کہ اخلاص کی شناخت کیا ہے تو فرمایا کہ عدم رؤیۃ الاخلاص فی الاخلاص۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے اپنے شیخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی وصیت بھی اسی مفہوم کے ایک قطعہ میں منظوم

کی ہے کہ ؎

مرا پیر دانائے روشن شہاب ۔۔۔ دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر خویش خوش بیں مباش ۔۔۔ دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

اس سے زیادہ عرض غیر ضروری ہے۔ اور یہ جسارت بھی آں مخدوم کے ایما اور فراخدلانہ تبصرہ طلبی کی بنا پر ہوئی ـــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کی لاج دونوں جہاں میں رکھے اور اپنی رضامندی کے کاموں پر استقامت کاملہ عطا فرمائے۔

عرض جسارت پہ معافی اور امید عفو کے ساتھ دعا کا ملتجی ہوں ۔۔۔ والسّلام مع الاکرام

(۲)

مکتوب جناب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ، ادارہ رحیمیہ دہلی

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! سلام مسنون

تنظیم اسلامی کے دونوں پرچے برابر پہنچ رہے ہیں۔ شکریہ تنظیم کا سارا لٹریچر خاکسار کے مطالعے میں رہتا ہے اور جامعہ رحیمیہ کے اساتذہ بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

درس تفسیر کے طلبہ کو بھی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اسے بغور مطالعہ میں رکھیں۔ بڑا استفادہ ہوتا ہے۔

تازہ "میثاق" میں علماء اور دینی مدارس سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ دعوتِ قرآنی کے نظام پر اپنی رائے دیں۔

آپ نے قرآن کریم کی بنیادی دعوت کو جس ترتیب اور تنظیم کے ساتھ پیش کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جن حضرات نے دعوتِ قرآنی کے ساتھ عقائد، کلام اور فقہ کے جزدی مسائل میں اپنا دامن الجھایا وہ اس دعوت کا حق ادا کرنے میں کما حقہٗ کامیاب نہیں ہو سکے۔

دعوت قرآنی اور اجتہادی مسائل میں الجھنا دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ـــــ ضرورت اس امر کی ہے کہ کچھ اللہ کے بندے اپنی جد وجہد کو اسلام کی بنیادی دعوت تک محدود رکھیں اور اس امّت کو خیر امت بنانے کے لئے ان کے فکر و عمل میں اسے بٹھائیں، جمائیں اور اس کے عملی تقاضوں کے لئے سرگرم عمل کریں۔

حضرت امام ولی اللہؒ نے دعوتِ قرآنی سے اپنی اصلاحی اور تجدیدی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسی لئے شاہ صاحب کے ہاں اجتہادی مسائل کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فقہی مسائل میں شاہ صاحب کے ہاں توسع ملتا ہے۔

آپ نے شاہ صاحب کے طریق فکر کو اپنا کر صحیح راہ اختیار کی ہے۔ مخالفین نے شاہ صاحب کی راہ میں

بھی الجھنیں پیدا کیں اور انہیں اس راہ سے ہٹانے کے لئے سازشیں پھیلائیں مگر شاہ صاحب اور ان کے جانشین اس راہ پر قائم رہے۔

شاہ صاحب کا اصلاحی جہاد جب قلمی جہاد سے جہاد بالسیف کی منزل میں داخل ہوا تو تحریک جہاد میں شاہ صاحب کی حکمتِ عملی قائم نہ رہی ـــــ اور نتیجہ میں تحریک جہاد درمیان میں ٹھنڈی پڑ گئی ـــــ

آپ نے قرآنی دعوت کو مرحلہ وار جس سائنٹفک طریقہ سے واضح کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔

خدا کرے کہ آپ اس دائرے سے باہر نہ ہوں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اپنی انتہا پسندانہ تنقیدوں میں نیک نیت تھے مگر مرحوم کے قلمی جہاد کا وہ حصہ لوگوں کے لئے تشویش کا سبب بن گیا اور ماضی کے حالات کے پیشِ نظر علماءِ حق کو بھی خوف زدہ کر دیا ـــ اس سے مودودی صاحب کی جدوجہد کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔

تنقید اسی حد تک ٹھیک ہے جس حد تک قرآن حکیم کی دعوت کو فائدہ پہنچے، محض علم و تحقیق کا مظاہرہ دعوتِ حق کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔

دعوتِ حق کی سیدھی ٹکر اس نام نہاد مسلم طبقہ سے ہے جو اسلامی احکام کے اجراء کو اپنی تعیش پسندی کے لئے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔

اسی طبقہ کی وسیع سازشوں اور فریب کاریوں سے بچا بچانا دعوتِ حق کے خدام کے لئے مشکل کام ہے پھر ہر طرف تیر چلانے اور سب کو للکارنے سے کیا فائدہ؟ آپ نے سلف صالحین اور معاصر علماء کے ساتھ احترام اور ادب کا اسوہ اختیار کر کے اس نکتہ کو سمجھا ہے۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ دعوتِ قرآنی کے خدوخال واضح کرنے اور اس کی بنیاد پر ایک تنظیم کی تشکیل کرنے کے ساتھ ہی اصلاحِ معاشرہ کا عملی پروگرام وضع کیا جائے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد مثبت طریقوں پر جاری کی جائے۔ منفی طریقوں سے امکان بھر بچنے کی کوشش کی جائے۔ انقلابِ قیادت جیسے نعروں کا پاکستان میں جو حشر ہوا وہ سبق آموز ہے۔

مولانا مودودیؒ ہر قدم پر یہ فرماتے رہے کہ دعوتِ حق کا کام کرنے والے حسبِ استطاعت مکلف ہیں، مگر مرحوم نے مسلم معاشرہ کی صحیح کمزوریوں کا صحیح جائزہ لئے بغیر استطاعت اور ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر بڑی لڑائی چھیڑ دی، مرحوم اپنی تاریخ ضرور بنا گئے مگر وہ دعوتِ حق کی تحریک کا کام کرنے والوں کے لئے مایوسیاں چھوڑ گئے۔

اب اقامتِ دین کی تحریک کی ناکامی ـــ اور وہ بھی ایک مسلم اسٹیٹ میں ـــ مخالفین کے لئے مثال بن گئی ہے۔

خمینی صاحب کی طرح یہ احمقانہ نعرہ کون لگائے کہ مسلمان کی منزل شہادت ہے ـــ گردن کٹانا ہے، خون بہانا ہے اور بہشت میں گھر بنانا ہے،

دعوتِ حق کو اس خون بہانے سے کچھ ملے یا نہ ملے، بس خون بہا دو۔
اسلام میں پہلی منزل ــــ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ ــــ کی ہے اس کے بعد ــــ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا ــــ کی ہے۔
جماعت کے تمام رفقاء کی خدمت میں سلام مسنون۔ کراچی کے دونوں واحدوں کو سلام پہنچا دیں۔ صاحبزادگان گرامی کی خدمت میں بھی اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی ــــ
نومبر کے شروع میں لاہور آنے اور آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔ خدا تعالیٰ خیر و عافیت رکھے، والسلام

(۳)

مولانا سیّد وصی مظہر صاحب مدظلہ العالی

تنظیم اصلاح و خدمت۔ حیدرآباد و سابق مدیر حیدرآباد و یکے از مستشارین تنظیم اسلامی

مکرمی جناب بھائی جمیل صاحب! السّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ

کافی مدت کے بعد آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں اور دیگر حالات کا علم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کا لحاظ کئے بغیر حد سے زیادہ مشقت کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مکمل آرام کرنا چاہیئے۔

"قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات" میں بہت فکر انگیز باتیں کہی گئی ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے رجم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گرفت بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے ایک گناہ گار مگر تائب صحابی کے بارے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ پھر روایات کے نام پر جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے اس کو ثبوت کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھا۔

جن نوجوان کی تحریروں پر ڈاکٹر صاحب نے اعتراض کیا ہے وہ میرے پاس موجود نہیں اس لئے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ایک اصولی بات میں یہ ضرور کہوں گا کہ اصلاحی صاحب منزہ عن الخطاء نہیں اور نہ انبیاء و رسل کے سوا کوئی اور منزہ عن الخطاء ہے۔ تاہم ایک یا چند غلطیوں کی وجہ سے کسی شخص کے پورے کارنامے کو مسترد کر دینا زیادہ انتہا پسندی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں تحقیق اور فکر و نظر کی آزادی مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ والسّلام!

(۴)

مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد والہ واصحابہ اجمعین۔

میں نے ماہنامہ میثاق بابت ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ ستمبر ۱۹۸۱ء شمارہ ۹۔ جلد ۳۳ میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہم کا خطاب جو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے پڑھا۔

جو کچھ انہوں نے علماءِ حق کے خدشات بیان فرمائے ہیں وہ درست ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب سمن آباد میں درس دیتے تھے تو میں نے اسی خیال سے ان سے عرض کیا تھا کہ درسِ قرآن پاک کے ساتھ درسِ حدیث بھی ضرور ہونا چاہیئے اور واقعۃً یہ ہے کہ اس سے بہت اعتدال رہتا ہے۔

قرآن پاک ذو وجوہ ہے۔ یہی حضرت علی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا (جب وہ خوارج سے گفتگو کرنے جا رہے تھے) کہ فقط قرآن پاک سے ہی مناظرہ میں استدلال نہ کریں بلکہ حدیث پاک سے بھی دلیل لیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ محاصرہ میں تھے تو انہوں نے ایک باغی سے فرمایا کہ قرآن پڑھ کر سنا۔ اس نے قتال و جہاد کے مضمون پر مشتمل آیات پڑھنی شروع کیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں۔ یہ میرے اور میرے ساتھی صحابہ کے حق میں اتری ہیں اسی پر محمول کی جا سکتی ہیں۔ آج کے تمہارے پیدا کردہ حالات پر نہیں۔

اسی دور میں حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے اخطاؤا فی التاویل یعنی قرآن پاک کی توجیہ اور اس سے استدلال میں یہ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں یعنی حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی بات ایک ہی تھی۔

حضرت ابن عمر خوارج سے لڑائیوں کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے وہ آیتیں جو کفار کے بارے میں اتری ہیں، مسلمانوں پر منطبق کر دیں ــــــ

ــــــ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں تو ان کا مغالطہ مشہور ہی ہے۔

ــــــ میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ:

ترجمۂ قرآن پاک میں جو امور ملحوظ رکھنے ضروری ہیں ان کی نشاندہی بھی فرماتے رہیں۔ ورنہ ڈپٹی نذیر صاحب اور جناب احمد رضا خاں صاحب کے ترجمے بھی تو موجود ہیں۔ جنہیں پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ یہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ قرآن پاک کا ترجمہ یہی ہے۔ حالانکہ وہ سب

سے کمزور قول پسند کرکے ترجمہ کر ڈالتے ہیں ۔ اور اصلاحی صاحب اور ان کے نئے مؤید اور نہ جانے کون کون جو بالکل ہی آزاد ہوکر ترجمے کر رہے ہیں تفسیریں لکھ رہے ہیں تو ضلوا واضلوا کے مصداق بن رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے، پرویز کے اور سرسید کے پیشرو معتزلہ ہیں۔ جنہوں نے دوسری صدی میں یہ اصول ایجاد کیا کہ جو بات عقل میں آئے گی وہ ہی مانی جائے گی۔ لہٰذا قرآن پاک کی آیات کی وہ توجیہہ کی جائے گی جو عقلاً ان کے نزدیک درست قرار پائے گی اور حدیث وہ مانی جائے گی جسے ان کی سمجھ قبول کرے گی یا اس میں ان کی عقل کے مطابق توجیہہ ممکن ہوگی ورنہ حدیث ہی کا انکار کردیا جائے گا ۔

سرسید نے اسی اصول کو اپنایا اور معتزلہ کی دلیلیں استعمال کیں۔ تفسیر میں بھی اور حدیث میں بھی وہ جید علماء کے شاگرد تھے اور بڑی محنت سے پڑھے ہوئے تھے ـــــ انہوں نے بہت وقت لگا کر اور اپنی پوری ذہانت صرف کرکے یہ کام انجام دیا۔ مقالاتِ سرسید جو سترہ جلدوں میں ہیں۔ اسی قسم کی بحثوں کا ذخیرہ ہیں۔ چند سال قبل انکارِ مہدی پر ایک محققانہ مقالہ شائع ہوا تھا۔ وہ اسی ذخیرہ سے لیا گیا تھا۔ بلکہ محقق مضمون نگار نے اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا۔ سرسید اس سے بھی زیادہ لکھ گئے ہیں ۔

عقل کا استعمال فرض ہے مگر اصول اسلام جاننا اور ان سے نہ ٹکرانا بھی فرض اوّلین ہے۔ اس سے غفلت، تباہی ہے ۔

کہ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی عقل کو اگر احکامِ اسلامی کے مدلّل کرنے کی طرف لگایا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ احکامِ اسلامی ہی عقلاً درست ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس گمراہی کی اصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑنا ہے۔ اسی سے شیعہ پیدا ہوئے اسی سے خوارج، جہمیہ اور مرجئہ قدریہ وغیرہ۔ اور آج تک بھی جو فرقے پیدا ہو رہے ہیں یا بدعات سامنے آرہی ہے وہ صحابہ کرام کی راہ سے ہٹنے کی وجہ سے ہیں۔ ارشادِ مبارک ما انا علیہ واصحابی کس قدر معجزانہ ہے۔ اگر کسی کے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت ہوگی تو وہ ان کی پیروی کرے گا اور جو ان کی پیروی کرے گا۔ نجات پا جائیگا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو علماء کو جگہ جگہ عوام میں درسِ قرآنِ کریم کے اہتمام کی تجویز دی۔ اس پر عمل سے بہت فائدہ ہوا۔ اب بھی راولپنڈی، لاہور، رحیم یار خاں اور خانپور وغیرہ میں اس کے اہتمام کا سلسلہ جاری ہے لیکن ہونا یہ چاہیئے کہ جہاں بھی کوئی عالم ہے وہ عوامی درسِ قرآن اور درسِ حدیث دونوں کا اہتمام کرے ۔

آٹھویں، دسویں، بارہویں جماعت کے لڑکوں کو اگر ائمہ مساجد روزانہ قرآن پاک کی چند

آیات پڑھا دیا کریں تو یہ طبقہ رٹہ لگانے کا ایسا ماہر ہوتا ہے کہ وہ اگلے دن ان کو زبانی سنا دیا کرے گا۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ اس طرح جو فائدہ ہوتا ہے وہ اندازہ سے باہر ہے۔ شاید حضرت شیخ الہندؒ کے ذہن مبارک میں اسی قسم کی کوئی اسکیم ہو۔ اس طرح قرآن پاک کا ترجمہ یاد کر لینے کے بعد جو اس طالب علم کی ایمانی کیفیت ہوگی وہ ضرور انقلابی ہوگی اور مستحکم۔

چشتی صاحب مرحوم کی کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں جو کتابوں میں تحریف کا ذکر آگیا ہے اس کے بارے میں وضاحت فرما دی جائے کہ کتب حدیث و فقہ کی ہمیشہ شروع سے چھان بین ہوتی رہی ہے وہ اس طرح کے تصرف سے منزّہ ہیں۔ محدثین کے اصول بہت سخت اور پختہ ہیں۔ اسی طرح فقہاء کے بھی۔ مذہبی امور کے پرکھنے کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے ہی شروع ہوگیا تھا بلکہ وہ اور حضرت علیؓ اس کے بانی ہیں۔ حضرت عمر گواہ طلب کرتے تھے کہ یہ حدیث جو تم بیان کر رہے ہو کسی اور کو بھی لاؤ جس نے یہ سنی ہو اور حضرت علی سب سے قسم کھلواتے تھے سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان سے قسم کا مطالبہ نہیں کیا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات سے ایک عام آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے واقعی فضول کام میں زندگی گذاری اور ہم قرآن پاک کی خدمت کر رہے ہیں تو ہم ان سے اچھے ہوئے۔ اس لئے یہ وضاحت فرمانی ضروری ہے کہ انہوں نے جو کیا وہ درست کیا۔ کیونکہ ایک مسلمان عالم جب کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو اسے قدرتی طور پہ دلیل کی طلب ہوتی ہے کہ میں کس دلیل سے اس راہ پر چلوں اور کیوں اس مسئلہ پر عمل کروں تو وہ مطالعہ کرتا ہے۔ مطالعہ میں دوسرے ائمہ کرام کی دلیلیں بھی سامنے آتی ہیں تو ان میں موازنہ کا مطالعہ کرتا ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اس کے مطالعہ کی بنیاد ہوتی ہے اور کتابیں اتنی زیادہ اور اتنی بڑی بڑی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لئے انسانی زندگی ناکافی ہے۔

اور ایسا آدمی جو حدیث پڑھاتا ہو حدیث کے میدان میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور اس میں سے کبھی نکلنا نہیں ہوتا۔ اسماء الرجال، حالات صحابہ، تاریخ صحابہ، سیرت، جغرافیہ اور بہت سے علوم میں اسے گہرا مطالعہ کرنا اور یاد رکھنا پڑتا ہے وہ بھی اصول کے تحت۔ بے اصول نہیں، تب جاکر انور شاہ بنتا ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ "کس چیز میں عمر برباد کی" محض تواضعاً ہے ورنہ جس مسلک پر کوئی عالم باعمل و متقی زندگی گذار رہا ہے، اس کی دلیل اور اسے ترجیح دینا خود عین دین ہے اور فرض منصبی۔ اور یہ کہ "صواب محتمل الخطاء ہے یا خطاء محتمل الصواب ہے" ایک ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے مگر عالم سبق پڑھاتے وقت یہ کہکر جان چھڑا لے اور دلائل پر روشنی نہ ڈال سکے، یہ ممکن نہیں اور اگر ان کے فرمان کا

مطلب وہی ہوتا ہے جو بظاہر ان کے الفاظ سے سمجھ میں آرہا ہے تو مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ شرح ترمذی نہ لکھتے تحدیث وغیرہ پڑھاتے وہ ان کے شاگرد تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کے داماد حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری مدظلہم شرح بخاری نہ لکھتے۔ بس سب ایک ہی رخ اختیار کرتے۔

بات یہ ہے کہ جو بندہ خدا کو پسند ہوتا ہے اس کا آخری دنوں میں یہی حال ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا عمر ضائع کر دی۔ حضرت اقدس مولانا مدنیؒ۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا محمود حسنؒ اور ان کا کیا ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک یہی فرماتے تھے کہ ہم نے جو نیکیاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی تھیں وہ قائم رہ جائیں بَرَدَ لَنَا اور جو کچھ آپؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کیا ہے وان کل عمل عملناہ بعدہٗ نجونا منہ کفافًا راسًا براس۔ بخاری ص ۵۵۷ وہ برابر سرابر ہو کر نجات ہو جائے (تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا)۔

حضرت عائشہؓ کا جب وقتِ وفات آیا تو حضرت ابنِ عباسؓ سے تعریفی کلمات سُنکر فرمانے لگیں وددت انی کنت نسیا منسیا (ان سے تعریفی باتیں سنکر) میرا جی چاہا کہ میں ایسی ہوتی کہ بھلا بھی دی گئی ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے اعمال کی قیمت خود نہ ڈالے۔ اس لئے آخر میں اللہ کے محبوب بندوں کی سچ مچ یہی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ یہ بالیقین کہتے ہیں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں ہیں۔ آخری وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ اس وقت ایک شخص نے تسلی کے لیے تعریفی کلمات کہے۔ تو اس کے ہر جملہ کا جواب عنایت فرمایا کہ یہ جو تم نے کہا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور آپؐ دنیا سے جب رخصت ہوئے تو مجھ سے راضی تھے تو یہ خدا کا احسان ہے۔ جو اس نے مجھ پر فرمایا۔ اور اسی طرح ماذکرتَ من صحبۃ ابی بکرؓ جو تم نے ابوبکرؓ کے ساتھ رہنے کے بارے میں ذکر کیا کہ وہ مجھ سے خوش رہے۔ اور جب اس نے وفات پائی تو وہ مجھ سے راضی تھے یہ بھی مَنٌّ مَنَّ اللّٰہُ بِہٖ عَلَیَّ۔ خدا کا احسان ہے۔ جو اس نے مجھ پر فرمایا۔ یعنی جو اچھائیاں تھیں وہ محض احسانِ خداوندی تھا وہ میری قابلیت نہیں تھی۔

بس جس پاکیزہ بندہ کی یہ حالت وفات کے وقت ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کا بہت ہی محبوب ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی نیکیاں بالکل سلامت رہیں تو مولانا انور شاہ صاحبؒ کو ان کے استاذ محترم حضرت شیخ الہندؒ کی طرح ڈبل اجر ملے گا۔ انشاء اللہ

ایک اس کام کا جو انہوں نے زندگی بھر کیا۔ دوسرے ان کی اگلی نیت کا۔ ہرگز کوئی کم عقلی کر کے اس خیال میں مبتلا نہ ہو کہ انہوں نے واقعی کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر واقعی کچھ نہیں کیا تھا تو ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہندؒ کو اس صدی کا مجدد اور مولانا انور شاہ صاحب کو قدماء کی نظیر کیسے فرماتے۔؟

رحمھم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ والحقنا بھم

ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدہ اور مفصل طرح سمجھا دیا ہے کہ آج کل فتنے کس طرح پیدا ہو رہے ہیں ان سے بچنا سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے۔ اور اس کی حفاظت سب سے بڑا اور اولین فرض ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چاروں ائمہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کی تقلید کا اگر کوئی سننے والا یہ مطلب لے کہ جس مسلک میں جو آسان چیز نظر آئے وہ اختیار کرے تو ائمہ اربعہ کے علماء نے بالاتفاق ناجائز فرمایا ہے۔ ہاں اس کے برعکس عمل کرنا مستحب ہے۔ معمولی سی مثال یہ ہے کہ شافعی مسلک یہ ہے کہ اگر کسی مرد کا ہاتھ ہتھیلی کی طرف سے بغیر کپڑا حائل ہوئے کسی عورت کے لگ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی اپنی ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور دستانہ پہنے ہوئے نہ تھا یا والدہ کے پاؤں پر چادر نہ تھی۔ بلا حائل پاؤں چھو رہا تھا تو وہ جب نماز پڑھنے لگے تو وضو کرے کیونکہ اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ حنفی حضرات کہتے ہیں کہ ایک حنفی شخص کے لئے بھی مستحب ہے کہ وہ دوبارہ وضو کرلے۔

اسی طرح اگر کسی شافعی شخص کے خون نکل آیا تو شافعی مسلک میں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ لیکن حنفی مسلک یہ ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شافعی حضرات فرماتے ہیں کہ اس شافعی شخص کو دوبارہ وضو کرلینا چاہیئے یہ ان کے نزدیک مستحب ہے۔ کیونکہ احتیاط پر عمل ہو رہا ہے اور دوسری صورت کہ ہر مسلک سے چن چن کر آسان مسائل لے لینا یہ اتباعِ ہوا و قرار دیا گیا ہے اس کا نام تلفیق ہے اور یہ حرام ہے۔

ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے تو شاید اس کے لئے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ آج کل کے علماء سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرنے سے یہ بہت زیادہ افضل ہے کہ ائمہ کی تحقیق پر چلے۔ رحمہم اللہ۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مثلاً مسلک حنفی کا کوئی مسئلہ متقی علماء کی نظر میں قابل عمل نہیں رہا۔ اس دور میں اس پر عمل کرنے سے اور خرابیاں لازم آئیں گی تو ایسی صورت میں

کسی بھی دوسرے امام کا مسلک لیا جاسکتا ہے ۔ مگر وہ ادھورا نہیں لیا جائے گا مکمل لیا جائے گا ۔ اور وہ تمام شرائط ملحوظ رکھی جائیں گی جو اس امام کے مسلک میں ہیں اور اس پر علماء کو جمع کرکے طے کرکے اعلان کر دیا جائے گا ۔ جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ مرتب فرمائی ہے

میرے ذہن میں آجکل کے دور میں سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات کا روزانہ صبح کو پڑھتے رہنے کا مشورہ آتا ہے ۔ تاکہ یہ پڑھنے والا غلط راستے پر لگنے سے اور دجالوں کے شر سے محفوظ رہے ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رکھے ۔ آمین !

(۵)

مکتوب جناب خسروی صاحب مدظلہ، کراچی

محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اس خامہ فرسائی کا محرک ماہ رواں کے "میثاق" کے صفحات ۱۹ تا ۶۱ پر آپ کی طویل تحریر ہے، جس میں آپ نے کافی شرح وبسط سے ان وجوہات کا تجزیہ فرمایا ہے جن کی بنا پر دورِ حاضر کے علمائے حق بھی آپ کی تحریک کی طرف سے شبہات میں مبتلا ہیں ۔ آپ نے اس میں سرسید، غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز صاحبان کا تو ذکر کیا لیکن مؤخرالذکر کے مرشد مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم کو نہ معلوم کیوں قلم انداز فرمادیا، حالانکہ اس پرویزی فتنہ کی اساس تو انہیں کی تعلیم وفکر ہے ۔ پھر مولانا امین اصلاحی صاحب کا ذکر بغیر نام لیے محض اشارۃً ہی کیوں کیا ! اور آج کل کراچی میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب فقہ القرآن جو اس تحریک کی آبیاری میں تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں ان کا ذکر کنایۃً بھی نہیں کیا ۔

مذکورہ بالا سطور تو محض ابتدائے کلام ہیں ۔ اصل بات جو عرض کرتا ہے وہ یہ کہ متقدمین علمائے حق کے متفق علیہ مسائل کی تردید کرنا تو اب متجددین کے نزدیک فرسودہ اور ناکام طریقہ سمجھا جاتا ہے ۔ کیونکہ اس سے براہِ راست وہ عوام جو ان علماء کے مجمع علیہ عقائد ونظریات کو مانتے آئے ہیں بھڑک اٹھتے ہیں ۔ اب تو اس سے زیادہ لتا طرانہ "ٹیکنیک" استعمال کی جاتی ہے یعنی متقدمین کے افکار کی تو تردید نہ کی جائے لیکن ان کے کردار کو مشتبہ کر دیا جائے ۔ جب کوئی معتقد اپنے معتمد علیہ کے کردار سے ہی بدظن ہو جائے گا تو اس کے افکار کو بھی خود بخود غلط سمجھنے لگے گا ۔ ویسے یہ ٹیکنیک بھی نئی نہیں ہے ۔ کیونکہ سبائیوں نے اسی کو برتا کہ ان تمام لوگوں کو جن کے ذریعے سے قرآن وسنت قرنِ اوّل کے بعد امت تک پہنچے ان تمام جامعین وحافظین وناشرین دین کو منافق ومرتد کہہ دیا

جائے۔ یہی تکنیک آپ کے ممدوح مودودی صاحب نے بھی اختیار کی کہ نہ صرف اجل صحابہؓ اور امہات المؤمنینؓ بلکہ انبیاء کے کردار کی بھی تنقید کے نام پر تنقیص کی تاکہ لوگ اگر منکر نہیں تو ان حضرات کی طرف سے تشکیک میں تو گرفتار ہو جائیں۔ جب ان حضرات کو نہ بخشا تو ائمہ اربعہؒ اور بخاریؒ و مسلمؒ کس گنتی میں ہیں! حدیث کے بارے میں تو انہوں نے دو ٹوک فرمایا ہے کہ جو "مزاج شناسِ رسولؐ" ہو جاتا ہے وہ محدثین کے قائم کردہ اصول و ضوابط کی بنا پر کسی حدیث کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ مزاج شناسی کے اس ملکہ کی بنا پر بیک نظر سمجھ جاتا ہے کہ آیا یہ قولِ رسولؐ ہے یا نہیں۔ اگر کوئی حدیث محدثین کے نزدیک غیر معتبر بھی ہے مگر وہ اپنی اس مزاج شناسیٔ رسولؐ کی بنا پر اسے قول یا فعلِ رسولؐ سمجھتا ہے تو وہ بلا تکلف اس پر عمل کرتا ہے۔ آپ کو تو خود معلوم ہے کہ اس جماعت کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے رسولؐ اللہ کے کوئی شخص، حتیٰ کہ انبیاء و رسل بھی تنقید سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ اس اصول کو انہوں نے خود بھی دل کھول کر برتا ہے اور اپنے مقلدین پر بھی لازم کر دیا ہے۔ ویسے مودودی صاحب بھی اس معاملہ میں منفرد نہیں ہیں کیونکہ انہیں کی جماعت کی ہم فکر و عمل جماعت اخوان المسلمون مصر میں بھی موجود ہے۔ قطب شہید مرحوم نے 'قرآن کے فنی محاسن' میں انبیاء، خصوصاً حضرت موسیٰؑ کے لئے جو دریدہ دہنی کی ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے جو مودودی صاحب کی نگارشات عالیہ میں ہے (قطب شہید کے اس مضمون پر میرا ایک محاسبہ "خدام الدین" میں شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو)۔ اور رسولؐ اللہ کو جو تنقید سے بالا فرمایا ہے یہ بھی تقیۃً ہے تاکہ ساری امت ہی نہ بھڑک اٹھے، ورنہ جگہ جگہ "بشری لغزش" بتا کر جو حضورؐ کے لئے لکھا ہے وہ ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

تو عرض یہ کرنا تھا کہ جہاں آپ نے سرسیدیت، قادیانیت، پرویزیت، چکڑالویت کو واشگاف الفاظ میں فتنے لکھا ہے وہاں مودودیت کے بارے میں مداہنت کیوں دیانت سے بعید نہ سمجھی؟

اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ اقبالؒ کے بارے میں جو آپ اس حد تک مدحت سرا ہیں تو کیا آپ نے ان کے منظوم و منثور افکار (بشمول مکاتیب و خطبات) میں کہیں کچھ مسلمہ حقائق و عقائد اسلام کے خلاف نہیں پایا؟ یعنی کیا آپ اسی طرح افکارِ اقبالؒ کو منزہ عن الخطاء باور کرتے ہیں جیسے جماعتِ اسلامی والے مودودی صاحب کو معصوم سمجھتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ اقبال مفکر بلکہ بڑے مفکر تھے لیکن ان کی ہر فکر بے لغزش تھی؟ اس کا دعویٰ کرنا بجائے خود کوئی عقیدہ ہے۔ اور باتوں کو چھوڑیئے، اقبالؒ نے نٹشے کو جو خط اپنا فلسفہ "خودی" سمجھانے

کے لئے لکھا تھا، جو اب تک نکلسن کے انگریزی ترجمہ "اسرارِ خودی" میں شامل ہوتا ہے اور جس کا اردو ترجمہ اقبال ہی کے ایک معتبر تلمیذ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا "میثاق" کے اقبال نمبر بابت دسمبر ۱۹۷۷ء میں آپ ہی نے شائع فرمایا تھا۔ اسی کو بہ امعانِ نظر ایک بار اور مطالعہ فرما لیجئے۔ اس میں اقبال نے نکلسن کو لکھا تھا کہ "انسانِ کامل" تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا کیونکہ کاروانِ انسانیت ہنوز جادۂ ارتقاء پہ گامزن ہے۔ لہٰذا انسانِ کامل تو آخر میں آئے گا جو تمام عالم میں دین نافذ کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ وہی عقیدہ نہیں ہے جو سبائیوں کا ہے اور جس کا اعلان خمینی صاحب نے اپنی ایک نشری تقریر میں کیا تھا جس میں برملا کہا تھا۔ تمام انبیاء و رسل بشمول محمد رسول اللہ کے ناکام رہے اور اسلام کا مکمل نفاذ تو امام مہدی (مستور) ہی کر سکیں گے۔ (اس سلسلہ میں میرا ایک طنزیہ مضمون "اقبال و خمینی کی فکری ہم آہنگی" ماہنامہ "الحق" میں شاید آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا) نکلسن کے نام اسی خط میں اقبال صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حشر صرف ان کا ہوگا جن کی "خودی" مکمل ہو چکی ہوگی، جبکہ قرآن و حدیث کی رو سے ہر ذی روح کا حشر برپا ہوگا۔ گویا وہ لوگ تو مزے میں رہے جن کی خودی کامل نہ ہو پائی۔ مگر جو لوگ خودی مکمل کر کے مرے وہ حساب کتاب اور جزا و سزا کے مستحق ہونگے۔ خطبات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ تخلیق و تقدیر خدا کسی Pre planned منصوبہ کے مطابق نہیں ہوتی۔ یہ تو وہی ایک پرانے فرقہ کا عقیدہ ہے نا، کہ جب خدا کوئی فعل کر لیتا ہے تب اس کے علم میں آتا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ کیا یہ افکار و عقائد وہی ہیں جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ "در بحرِ فہم غیر قرآں مضمر است" تو "روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا" میں یہ نہیں کہتا کہ اقبال اساسی طور پر غلط فکر تھے بلکہ یہ کہ وہ فطری طور پر سب سے پہلے شاعر تھے اس لئے جس وقت جو خیال بندھ گیا وہ باندھ دیا۔ یعنی "فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ" کے صحیح مصداق تھے۔ مانا کہ آپ ان کے وہی اشعار اپنی تقریروں اور تحریروں میں نقل کرتے ہیں جو آپ کے موقف کی تائید میں ہوتے ہیں لیکن اس کا اثر جو آپ کے سامعین اور قارئین پر ہوتا ہے اس پر آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آپ کے معتقدین تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس شخص کے مداح ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں اور بطور استدلال و امثال اس کے اقوال پیش کیا کرتے ہیں وہ یقیناً سو فی صد صحیح الفکر اور واقعی "مفکرِ اسلام" ہی ہوگا۔ لہٰذا پھر اگر کوئی غلط فکر پارہ بھی اقبال کا سنتے یا پڑھتے ہیں اسے بھی آپ کی سند کی وجہ سے مستند ہی سمجھتے ہیں۔ اقبال کی اسی فکری کوچہ گردی کی وجہ سے تو سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک اس کے اشعار کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ انہیں پر موقوف نہیں، خواہ بالکل جاہل بھی کوئی ہو، ہر شخص کی فکر میں ارتقا ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ صحیح سمت میں ہو۔

اس نفر خراشی کی جرأت اس وجہ سے کی ہے کہ میں خالصتاً لوجہ اللہ ابھی تک تو آپ سے ایسی

ہی عقیدت اور محبت رکھتا ہوں جیسی مودودی صاحب سے تقسیم ہند تک تھی۔ لہٰذا آپ کی تحریروں کو بغور پڑھتا بھی ہوں اور تجزیہ بھی کرتا ہوں۔ کئی بار کسی فقرہ سے تکدر بھی ہوا (جیسے اتحاد بین المسلمین کی تبلیغ میں مسلمانوں کے مختلف مکاتیب فکر کے ساتھ اہل تشیع کو بھی شامل کردینا) مگر یہ جرأت نہیں کی۔ اب آپ کی اس تحریر نے خود بخود یہ تحریک کی کہ آپ سے درخواست کروں کہ جب آپ نے اپنی دعوت الی القرآن کی وضاحت کے سلسلہ میں پرویزیت وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے تو مودودیت پر بھی دیانت کے ساتھ اور کھلے دل سے اپنے موقف کو بیان فرمادیں کہ متقدمین علمائے حق کے افکار اور مجمع علیہ عقائد و نظریات کے متعلق لوگوں میں شکوک پیدا کرنے سے بڑا فتنہ ان دنوں یہ ہے کہ ان حضرات کے کردار کو لوگوں کی نگاہوں میں داغدار بنادیا جائے تاکہ پھر ان کے افکار و عقائد خود بخود ہی مشکوک سمجھے جانے لگیں۔ اقبال کے متعلق بھی آپ کی طرف سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ جو ان کے اقوال نقل کیا کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ ان کے سارے ہی افکار و اقوال کو معتبر سمجھا جائے بلکہ جو قرآن و سنت کی کسوٹی پر پورے اتریں وہ صحیح ہیں اور جو مسلمہ عقائد کے خلاف ہوں وہ مغربی فلسفہ کا اثر ہے۔

امید ہے کہ میری یہ معروضات تکدر طبع کا باعث نہ ہوں گی اور ان کی روشنی میں آپ کی واضح تحریر میثاق کی قریب ترین اشاعت میں شامل ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خیالات صرف میرے ہی نہیں بلکہ ان میں آپ کے اور بھی بہت سے مداح اور میثاق کے قارئین میرے شریک ہوں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ عریضہ بھی من وعن شائع فرماکر اسی کے ساتھ جواباً آپ کی تحریر شائع ہو تاکہ قارئین سوال و جواب کو بیک وقت پڑھ سکیں۔

آپ کے اسی پیش نظر مضمون کے سلسلہ میں کہ (علما آپ کی تحریک کی طرف سے متشکک ہیں) ایک دلچسپ تحریر ماہنامہ "الخیر" (ملتان) کے شوال ۱۴۰۴ھ کے شمارے کے صفحات ۴۴ تا ۴۶ پر "ڈاکٹر اسرار احمد سے استفسار" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ "استفسار" جنوری ۸۴ء کے "میثاق" میں آپ کے مضمون کے سلسلہ میں ہے اس "استفسار" میں آپ سے پوچھا گیا ہے کہ آپ نے جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اہلیت امام الہند کا ذکر کیا ہے وہ کہیں اپنے امام پاکستان بننے کی طرف تو پیش قدمی نہیں ہے؟ میں نے اس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا یوں ضروری سمجھا تاکہ آپ کے علم میں آجائے کہ آپ کی تقاریر و تحاریر سے کس قسم کے شکوک پیدا ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ والسلام، خضر دی :

(۶)

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی صاحب

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تعارف چند سال سے حاصل ہے جبکہ ان کی تقاریر و رسائل پڑھنے سننے کا اتفاق تو بہت پہلے ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام تو بہرحال معصوم ہیں اور ان کے بعد یہ

شرف کسی کو حاصل نہیں، تاہم صحابہ کرام علیہم الرضوان کی محفوظیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے اور ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا تھا کہ وہ جاہلیت کے بھرپور دور میں اپنے آخری رسول ؐ کی صحبت و رفاقت اور دین کی حمایت و نصرت کے لئے ان کا انتخاب کرے۔ ان کے بعد قرناً بعد قرنٍ ایسے حضرات دنیا میں آتے رہے جو اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی حمایت و نصرت میں کھپاتے رہے۔ ان حضرات میں سے کسی کے لئے معصومیت چھوڑ محفوظیت کا دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ کہنا درست ہوگا کہ ان زمانوں میں ہزار ہا ہزار ایسے لوگ تھے جن کی زندگیوں میں خیر غالب تھا اور ان کے دل دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے اندر درد رکھتے تھے۔ ادھر ہر زمانہ میں ایسے بھی لوگوں کی کمی نہیں رہی جو بڑے خوبصورت دعاوی کے ساتھ میدان میں آئے اور "کلمۃ حقٍ ارید بہا الباطل"[1] کا رول ادا کرتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی ایسے لوگ بہت ہیں اور ان کا بالعموم رویہ ایسا ہے کہ وہ قرآن کے نام سے اپنا مشن جاری کرتے اور تحریکات اٹھاتے ہیں۔ قرآن اور حمایت و نصرتِ دین کے حوالہ سے لوگوں کا ایک طبقہ جب ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو وہ یکدم ایسا پلٹا کھاتے ہیں جس کے نتیجہ میں قرآن و سنّت کی نت نئی تعبیرات اور اسلاف پر عدم اعتماد کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں ـــــ ایسی صورت پیدا ہو جانے کے بعد علماءِ کرام جنہیں بجا طور پر "ٹریفک کے سپاہی" کا مقام حاصل ہے، ایسے لوگوں اور حضرات و افراد سے خلقِ خدا کو متنبہ کرتے ہیں اور انہیں احساس دلانے کی سعی کرتے ہیں ـــ تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بے راہ روی سے محفوظ رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس حالیہ خطاب میں، جو انہوں نے جامع دارالسلام باغِ جناح میں ارشاد فرمایا، بعض ایسے ہی افراد کی نشاندہی کی ہے اور بڑی دلسوزی سے کہ اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نسل در نسل منتقل ہونے والے دین کو اسی انداز سے برتا جائے جو قدیم طریق ہے تو اسی میں خیر ہے ـــــ رہ گیا معاملہ جدید تمدّنی مسائل اور ان پر غور و فکر کا، تو ظاہر ہے کہ ہر اہل آدمی ایسا کام کر سکتا ہے بلکہ کرنا چاہیئے تاکہ اسلام کے روئے روشن پر یہ حرف نہ آئے کہ وہ جاری زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا تاہم یہ ضروری ہے کہ اس آڑ میں مسلّمات مجروح نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس خطاب کو نافع بنائے اور ہم سب کو اپنے اسلاف گرامی سے وابستہ رکھے۔

(۷)

مکتوب جناب محمد عبد البر صاحب مدظلہ العالی ناظم جماعت اشاعت التوحید والسنۃ، کراچی ڈویژن

محترم و مکرّم جناب مدیر صاحب! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

---

[1] "بات درست اور صحیح لیکن اس سے مراد غلط اور باطل"

قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب وقت کی اہم ضرورت پوری کرتا ہے اور "خدشات" کا ممکنہ حد تک "شافی" جواب بھی ہے۔ لیکن ان خدشات کی وجوہات اور ـــــ قرآن کے نام پر اٹھنے والے فتنوں کے طریق کار کے حوالہ سے توضیح اس حیثیت سے "تشنہ شفا" رہ گئی ہے کہ علماء کرام کے اس قسم کے خدشات دراصل اس بنا پر ہوتے ہیں کہ قرآن اور علوم دین کی خدمت کا بیڑا اچانک ایسا شخص اٹھانے لگتا ہے جس نے ان سرچشموں اور ذرائع سے علم حاصل نہیں کیا ہوتا جو علماء کرام کے ہاں معروف یا مسلم ہوتے ہیں۔ جیسے مودودی صاحب مرحوم یا ان بزرگ کا معاملہ ہے جن کی مثال ڈاکٹر صاحب نے اپنے مذکور خطاب میں دی ہے۔ ایسا شخص فطری طور پر فتنہ بنتا ہے اور عجب کا شکار ہو جاتا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے علماء کرام کی طرف رجوع اور اس پر عمل کا جو ذکر کیا ہے اس پر اگر وہ سختی اور خلوص سے کاربند رہے تو ان کے بارے میں "خدشات" کا قلع قمع ہو جائے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ علماء کرام سے ربط و تعلق محض "رسمی" اور خانہ پُری کے طور پر نہ ہو۔ بلکہ باقاعدہ استفادہ کی نیت سے ہو اور ان کے "افادات" کو وہ مقام دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔

اس ضمن میں یہ گذارش بھی بے محل نہ ہوگی کہ کوئی بڑا مسئلہ، محورِ دعوت بنانے سے پہلے وقت کے مشاہیر علماء سے "منظور" کروا لینا چاہیئے۔ مثلاً "دینی ہیئت اجتماعیہ" کے لئے "بیعت کا طریق کار" ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہر حال ایک پہلو سے نزاعی بن گیا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں "اہل علم" سے پہلے "استصواب" کر لیا گیا ہوتا تو بعد میں "فتوای" اور اس سے بڑھ کر "اختلافات و خدشات" پیدا ہونے کی نوبت نہ آتی۔ "جدید اصطلاحات" کے حوالے سے توحید کے بدیہی استدلالات پیش کرنے کا مقصد، میری ناقص رائے کے مطابق، یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ شرعی اصطلاحات، جو صدیوں سے متوارث اور منقول چلی آرہی ہیں، کی اہمیت و افادیت کا انکار کر دیا جائے یا انہیں بدل دیا جائے۔ ورنہ "عرضِ احوال" کے آخری پیراگراف میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی ایک تطبیقی مثال یہ بھی بن جائے گی۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔

فقط والسلام

(۸)

مکتوب جناب ایس۔ بی علی صاحب مدظلہ۔ کراچی

جناب محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے ماہنامہ "میثاق" ماہ ستمبر ۸۳ء میں آپ کا مطبوعہ خطاب "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" حقائق پر مبنی ہے اور جن

فتنوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے ان سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسا صاحب بصیرت ایک ایسے فرقہ کی فتنہ انگیزیوں کو نظر انداز کر گیا جو بارہ سو سال سے جسدِ اسلامی میں زہر پھیلا رہا ہے جس نے اسلامی عالمی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور آج بھی وہ انہی ریشہ دوانیوں میں معروف ہے۔ اس سے میری مراد شیعہ فرقہ ہے۔ جو تحریفِ قرآن۔ تحریفِ کلمہ۔ الوہیت علیؓ ائمہ کا معصوم عن الخطاء اور حاملِ وحی ہونے کا قائل ہے۔ اور یہ بات انہی کی مستند کتابوں میں مثلاً اصول کافی۔ رجال کشی وغیرہ سے ثابت ہے۔ نیز جس کے متعلق مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ ہے کہ وہ کافر ہیں۔ فتویٰ درج ذیل ہے۔

"شیعہ واقعی کافر ہیں کیونکہ وہ قذف ام المؤمنینؓ اور سب الشیخینؓ کے علاوہ تحریف فی القرآن کے قائل ہیں"

اس پر کئی سنی اکابرین کے دستخط ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ مولانا منظور احمد نعمانی مدیر الفرقان۔ مولانا محمد ابراہیم (دیوبند)۔ مولانا انوار الحق امروہہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بریلوی مکتب فکر کے بانی مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے شیعوں کے رد میں مستقل کتاب "رد الرفضہ" لکھی ہے جس میں ان کا کفر واضح کیا ہے۔ یقیناً یہ سارے حوالہ جات بلکہ اس سے زیادہ جناب والا کے علم میں ہونگے لیکن "رجم" کے سلسلہ میں شیعہ فرقہ کے تمام (Schools) کو سنی مسلک کے چاروں ائمہ کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ میثاق ص۴۹۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ فرقہ دائرہ اسلام میں شامل ہے اور اسطرح ہم (نعوذ باللہ) بالواسطہ ان کے نظریہ تحریفِ قرآن۔ تحریف کلمہ ائمہ کا معصوم عن الخطاء اور حامل وحی ہونا تسلیم کر رہے ہیں جو ختم نبوت کے مسئلہ کو بھی مشکوک کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے دین کی اساس کیا ہو گی؟

اس سلسلہ میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ براہِ کرم آپ رہنمائی فرمائیں تاکہ میری طرح اور بہت سے لوگ جو ذہنی خلش کا شکار ہیں، صحیح صورتِ حال سے واقف ہو جائیں۔

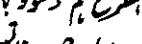

برائے توجہ!

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

رفتارِ کار

ماہِ ستمبر کا پہلا اور دوسرا ہفتہ دعوتی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑا بھرپور گزر رہا ہے۔ پہلے ہفتہ کی سرگرمیوں کی روداد میثاق اکتوبر میں آچکی ہے۔ ۸ ستمبر کو امیرِ محترم نے مسجد دارالسلام میں عید الاضحیٰ کی نماز کی امامت کی اور خطبہ ارشاد کیا۔ چونکہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمعہ تھا۔ لہٰذا خطابِ جمعہ کا بھی اہتمام ہوا۔ ۹ ستمبر کو امیرِ محترم کراچی تشریف لے گئے۔ جہاں جامع الصفا شریف آباد عقب الاعظم اسکوئر میں ۹ اور ۱۰ ستمبر کو بعد نماز مغرب سورہ تغابن کا درس مکمل کیا۔ سورۃ تغابن کو ایمانیات ثلاثہ اور ان کے ثمرات و نتائج کے ضمن میں جو اہم مقام حاصل ہے اس سے ہر وہ شخص جو قرآن حکیم سے شغف رکھتا ہو۔ بالعموم اور رفقاءِ تنظیم بالخصوص اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ۱۱ ستمبر کو عام تعطیل تھی۔ لہٰذا اس روز تنظیم اسلامی کراچی کا ایک خصوصی اجتماع رکھا گیا تھا جس میں امیرِ محترم نے شرکت فرمائی اور مختلف تنظیمی اور دعوتی مسائل پر اس اجتماع میں سیر حاصل تبادلۂ خیال اور گفتگو ہوئی ــــ کراچی سے امیرِ محترم کی واپسی ہوئی۔ موصوف مسلسل دوروں کے سبب کافی مضمحل نظر آرہے تھے۔ تکان کے اثرات نمایاں تھے لیکن بایں ہمہ ۱۲ ستمبر کو امیرِ محترم نے لاہور چھاؤنی میں جناب محمود احمد صاحب کے مکان پر بعد نماز مغرب شرکت کی جس میں علاقے کے نمایاں حضرات مدعو تھے۔ امیرِ محترم کی تشریف آوری سے قبل راقم نے تنظیم اسلامی کی دعوت سے شرکاء کو متعارف کرایا۔ بعدۂ امیرِ محترم جب تشریف لائے تو آپ نے بھی اختصار کے ساتھ دعوت کے اہم مبادی و خصائص بیان کئے اور شرکاء کے سوالات کے شافی جوابات دیئے۔

۱۵ ستمبر کو مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے!" کے موضوع پر تفصیلی خطاب ارشاد کیا۔ حالانکہ ۱۴ ستمبر کی شب سے موصوف کمر میں شدید درد محسوس کر رہے تھے۔ اسی شب کو بعد عشاء امیرِ محترم کو عالی مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ لاہور پر تنظیم اہلِ سنت والجماعت کے چالیسویں اجلاس میں تقریر کرنی تھی۔ جہاں حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہٗ العالی بھی مدعو تھے۔ جو دعوتِ توحید اور مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام و افعال کی تردید کے ضمن میں پاکستان گیر شہرت کے حامل ہیں۔ شاہ صاحب محترم نے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ خطاب سے قبل محفل طعام میں جس کا اہتمام عبدالرشید رحمانی نے کیا تھا شاہ صاحب قبلہ کی امیرِ محترم سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے میثاق میں شائع ہونے والے "الہدیٰ" کے سلسلے اور اگست و ستمبر میں شائع ہونے والے امیرِ محترم کے خطابات پر موصوف کو تحسین بھی فرمائی اور ان کے حق میں دعا بھی کی۔

بعد نمازِ عشاء عالی مسجد میں محترم شاہ صاحب مدظلہٗ اور دیگر علماء کی موجودگی میں امیرِ محترم نے "توحید عملی کا اقامتِ دین سے ربط و تعلق" کے موضوع پر قریباً پونے دو گھنٹے مفصل و جامع خطاب کیا۔ یہ وہی موضوع ہے جس پر میثاق میں قسط وار امیرِ محترم کا ایک خطاب اور درس شائع ہو رہا ہے۔ کمر کے درد اور طبیعت کے اضمحلال کے باوجود خاص اللہ کے فضل سے امیرِ محترم کی یہ تقریر خطابت اور اثر پذیری کے اعتبار سے خاصے کی تقریر تھی۔

چنانچہ اس تقریر سے متأثر ہو کر شاہ صاحب مدظلہ نے جن تأثرات و مشاہدات کا اظہار فرمایا انہیں ٹیپ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

"ارشاداتِ شاہ صاحب"

حضرت شاہ صاحب مدظلہ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد سورۂ رعد کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:۔

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرحیم
لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا
كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ
اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ٥

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قبلہ نے اپنے موضوع "توحید فی الحقیقت کیا ہے؟" پر گفتگو سے قبل بطور تمہید فرمایا:

"بزرگو! بھائیو! عزیزو! ہمارے محترم و مکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماشاء اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس خوبی، اخلاص اور سوز اور دردِ دل سے توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کو مفصل اور پورے اجزاء کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور پھر الحمد للہ کتاب و سنت کے پورے حوالے سے اور صحیح تشریح سے آپ حضرات تک فصل الخطاب کے ساتھ پیغامِ حق پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جناب محترم کی تقریر سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اللہ تعالیٰ دینِ حق پر، دینِ قیم پر، دینِ خالص پر جناب مکرم کو استقامت اور اخلاص کی نعمت نصیب فرمائے اور جس ولولے، جس جذبے، جس محنت کے ساتھ یہ رضائے الٰہی کو مقصود بنائے ہوئے دعوتِ حق کا کام کر رہے ہیں، تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اپنوں کی بھی باتیں سن رہے ہیں، غیروں کے طعن و تشنیع بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اس کام میں وقتاً فوقتاً جو تکالیف اٹھاتے اور جھیلتے ہیں وہ ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے اور اپنے فضل و رحمت سے ہماری قسمت میں یہ سعادت عطا فرما دے کہ اللہ اللہ جس طرح ڈاکٹر صاحب دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں کہ دینِ توحید اجتماعی رنگ میں غالب اور نافذ ہو جائے۔ دین پورا کا پورا قائم ہو۔ اس طرح ہم بھی اس کام میں لگ جائیں۔ ان کی تو کوشش ہے، محنت ہے۔ ان کے ساتھیوں کی محنت ہے اور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے یہ اس کے ہاتھ میں ہے البتہ ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہئے جو ہم سے بن سکے۔ اس کے مصداق تو ہم بنیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ اس کے ہاتھ میں ہے کہ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ٥ صبر و استقامت اسی طرح جاری رہا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ ورنہ ایک مسلمان کہلانے والے کا جو فریضہ ہے اس کے لئے تو ماشاء اللہ ڈاکٹر صاحب نے تن من کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ یہ محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ میرا حقیقی تأثر ہے کہ مجھے ان کی تقریر سن کر الحمد للہ ثم الحمد للہ سب سے بڑی خوشی، سب سے بڑی راحت اور سب سے بڑا اطمینان دل کو ہوا کہ یا اللہ اس

دور میں تو نے اپنے فضل و کرم سے کسی کو تو یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ تیرے دین خالص کے لیے، دینِ حق کے لیے اجتماعی طور پر اسے کامیاب بنانے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اے اللہ تو اس کو یاد آور فرما ——— مایوسی کے حالات تو ہوں گے لیکن : وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی اور کفر ہے : وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ باقی کچھ لوگ بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کام کی کامیابی مشکوک ہے۔ یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔

دنیا میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اللہ کے نزدیک کرنے کا کام یہی ہے۔ میں کون اور ڈاکٹر صاحب کون! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء میں سے بعض نبی جن کی صداقت پر، جن کی دیانت پر، جن کی امانت پر، جن کی محنت پر، جن کی دعوت پر، جن کے اخلاص پر، جن کی استقامت پر، جن کی قربانیوں اور ایثار پر کسی کو اعتراض کا موقع نہیں مل سکا تو اللہ تعالیٰ الا اس کے نبی پاک نے فرمایا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ ایک امتی ہو گا جنہوں نے دعوت کو پوری طرح قبول کیا ہو گا۔ اور کسی کے ساتھ ایک بھی نہیں"۔ یہ تو حدیث ہے اور صحیح ہے۔ اللہ اللہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کا شکوہ نقل فرمایا ہے: رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ اے میرے مالک اے میرے آقا اور مختار میں نے خالص توحید اور صرف تیری عبادت کی دعوت دی اور اس کام کے لیے میں نے نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ لیکن نتیجہ! فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا۔ یہ میری دعوت سن کر راتوں کو بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور دن کو بھی ——— آگے آیا کہ ثُمَّ اِنِّىْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ میں نے مجلسوں میں اعلانیہ بھی دعوت دی ——— جیسے ڈاکٹر صاحب نے آپ حضرات کے سامنے دعوت پیش کی ——— اور میں نے پوشیدہ ایک ایک کے پاس جا کر بھی دعوت دی تاکہ مجلس میں بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس طرح آ جائے۔ الغرض دعوت پہنچانے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ نہ اعلان چھوڑا نہ اسرار چھوڑا۔ اپنا تمام آرام تج دیا ——— ڈاکٹر صاحب محترم کا نام بھی آ گیا ——— لیکن ان کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت پر کتنے لوگ ایمان لائے! کتنے لوگوں نے اسے قبول کیا! اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ نوح علیہ السلام کے اخلاص میں ان کی استقامت میں، ان کے ایثار، ان کی صداقت میں، ان کی شجاعت میں نہ کمی تھی نہ کسی کو شک تھا۔ لیکن اللہ کی شہادت سن لو کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا! وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ "بہت ہی تھوڑے آدمی ان پر ایمان لائے"۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے جو کشتی بنائی وہ کتنی بڑی ہوگی! آپ خود تصور کر لیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کل انشی [۸۰] افراد تھے۔ ذرا سوچو کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت کا نتیجہ یہ تھا۔ اگر فی برس ایک آدمی بھی دعوت قبول کرتا تو ساڑھے نو سو تو آتے۔ چلو دس دس برس میں ایک آدمی آتا تو بھی پچانوے [۹۵] تو ہوتے۔ لیکن بعض روایات میں انشی سے بھی کم تعداد آئی ہے۔ گل ہم چالیس [۴۰] افراد۔ ایک اور روایت بھی ہے جس میں نو افراد کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ اللہ اللہ۔ کام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میرے ساتھ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ دیکھنے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ اس کے ساتھ فلاں بزرگ ملے یا نہیں ملے۔ یہ دیکھو کہ کام صحیح ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام کے ارشاداتِ گرامی کے مطابق ہے تو چشمِ ما و دلِ ما روشن۔ پھر قبول کرنا چاہیئے۔ زیادہ لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ اس میں اعلیٰ قسم کے لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معاملہ

نہ ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آنجنابؑ کے ساتھ کیا تھا: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۔ اے نوح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سردار لوگ، بڑے بڑے زمین لوگ، بڑے بڑے باوجاہت لوگ وہ تو تیرے ساتھ آئے نہیں۔ ہماری قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ کم عقل اور بے وقوف لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگ گئے ہیں..... اللہ واللہ۔ میں آپ لوگوں کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا ساتھ دیں۔ اس میں ہماری دنیا اور عاقبت کی بھلائی ہے۔"

ہفتہ سے امیر محترم کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ لہٰذا شمالی اور شرقی تنظیموں کی طرف سے لاہور چھاؤنی میں ۱۷ تا ۱۹ ستمبر کے لئے جو پروگرام طے تھے اور جن کے لئے ان تنظیموں نے کافی محنت سے پبلسٹی بھی کی تھی، ملتوی کرنے پڑے۔ ۱۵ ستمبر سے ۲۸ ستمبر تک قریباً ۱۴ یوم ایسے گزرے ہیں اور شاید امیر محترم نے جب سے دعوتی کام شروع کیا ہے یہ پہلا موقع ہے کہ امیر محترم کا کوئی درس یا تقریر کا پروگرام نہیں ہو سکا۔ بحمداللہ اب موصوف کی طبیعت بہتر ہے۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر کو مسجد دارالسلام کا خطاب جمعہ اور ۲۹ ستمبر کو بعد نماز مغرب جامع قرآن، قرآن اکیڈمی میں امیر محترم کا درسِ قرآن بھی ہوا جو مسلسل درس کی کڑی ہے اور اس میں سورۃ زخرف زیر درس ہے۔ ساتھ ہی امیر محترم نے یکم اکتوبر سے اپنی دعوتی سرگرمیوں کی تجدید فرما دی ہے۔ اسلام آباد کا دورہ ہو رہا ہے اور "دین حق اور اس کے تقاضے" کے موضوع پر انشاء اللہ امیر محترم کا سورۃ صف کی روشنی میں ۸ اکتوبر بروز پیر بعد نماز مغرب خطاب ہوگا۔

جمعہ کو بعد نماز مغرب مسجد باغ والی بیرون شاہ عالم مارکیٹ جو ہفتہ وار درسِ قرآن ہوتا ہے، فی الوقت اس کو محترم ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب دے رہے ہیں۔

تمام رفقاء اور متوسلین سے امیر محترم کی کامل صحت کے لئے دعا کی استدعا ہے۔

راقم: عبدالرزاق بہ تعاون بھائی جمیل صاحب)
نائب امیر برائے لاہور

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

کو مانتے ہیں۔ اور اس کی رو سے قرآن کو INTERPRET کر رہے ہیں ہمارے یہاں عملی اعتبار سے قرآن کی INTERPRETATION بالکل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ پھر اگر ہماری تاریخ کے ادوار میں حضورؐ سے لے کر تا امروز جن مسائل میں تسلسل، تواتر اور اجماع موجود ہو تو دوسری کوئی بات کہنے کا کسی کو حق ہی نہیں ہے۔ الّا یہ کہ قرآن پر کسی وجہ سے اعتماد نہ رہا کہ یہ مُنَزَّل مِنَ اللہ ہے اور دل میں شک اور ریب کے کانٹے چبھ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس گمراہی، اس ضلالت سے مجھے، آپ کو اور جمیع المسلمین کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

عَن انسؓ عَن النّبیّ صَلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قَالَ

لَایُؤمِنُ اَحَدُکُمْ

حَتّی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

رشید جیولری ہاؤس لاہور

ٹمپل روڈ — سوہا بازار

۳۱۱۴۰ — ۳۰۴۳۳۳   ۶۴۴۳۳ — ۵۶۴۷۹

پروپرائیٹر: اے وحید

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱
۲۳۹۳۱

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپرس روڈ۔ لاہور

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

امپورٹ - ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ

ربی بو انٹرنیشنل

فون: ۳۰۳۳۵۵ / ۳۰۳۳۷۷

برآمدی اشیاء

آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ❖ بیڈ شیٹس
کاٹن کلاتھ ❖ کاٹن گارمنٹس ❖ احرام تولیہ ❖ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ❖ لکڑی کا فرنیچر۔

درآمدی اشیاء

لاکھ دانہ ❖ سٹکر فلم ❖ سوچ سٹارٹر
ربڑ لیٹکس ❖ پولیسٹر ریان۔

مرکزی دفتر

I فلور غلام رسول بلڈنگ ۶۰ شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور

ذیلی دفاتر:- کراچی - فیصل آباد۔

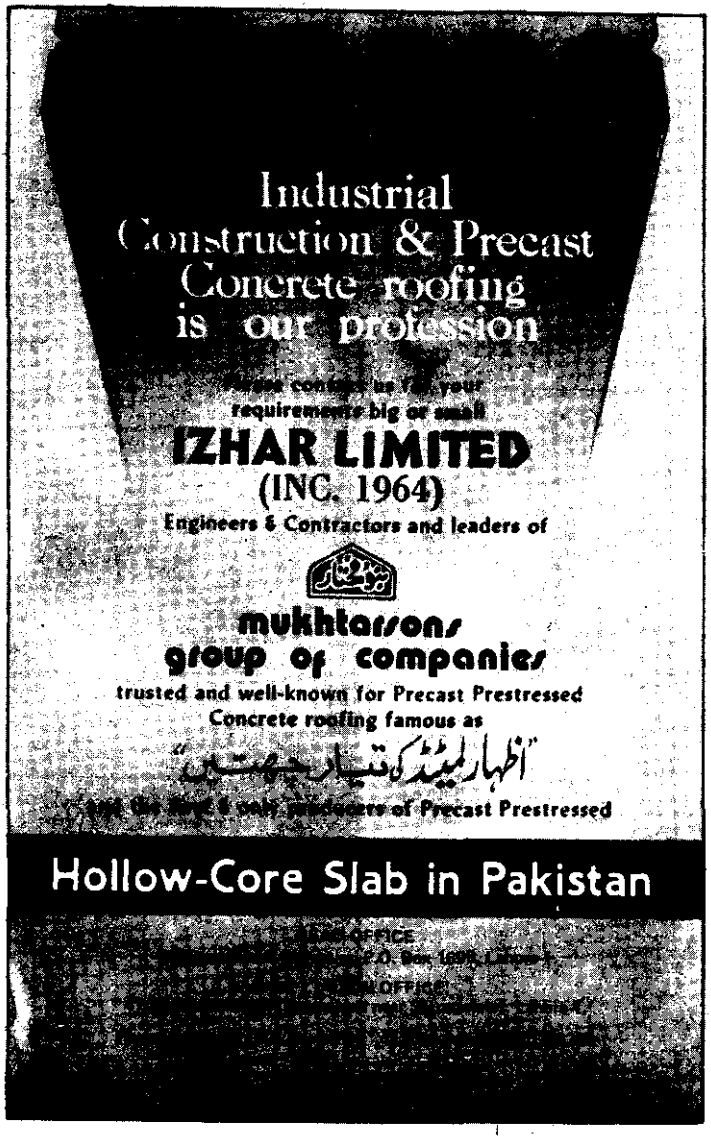
Industrial
Construction & Precast
Concrete roofing
is our profession
Please contact us for your
requirements big or small
IZHAR LIMITED
(INC. 1964)
Engineers & Contractors and leaders of
mukhtarsons
group of companies
trusted and well-known for Precast Prestressed
Concrete roofing famous as
"اظہار لمیٹڈ کی تیار چھتیں"
Hollow-Core Slab in Pakistan

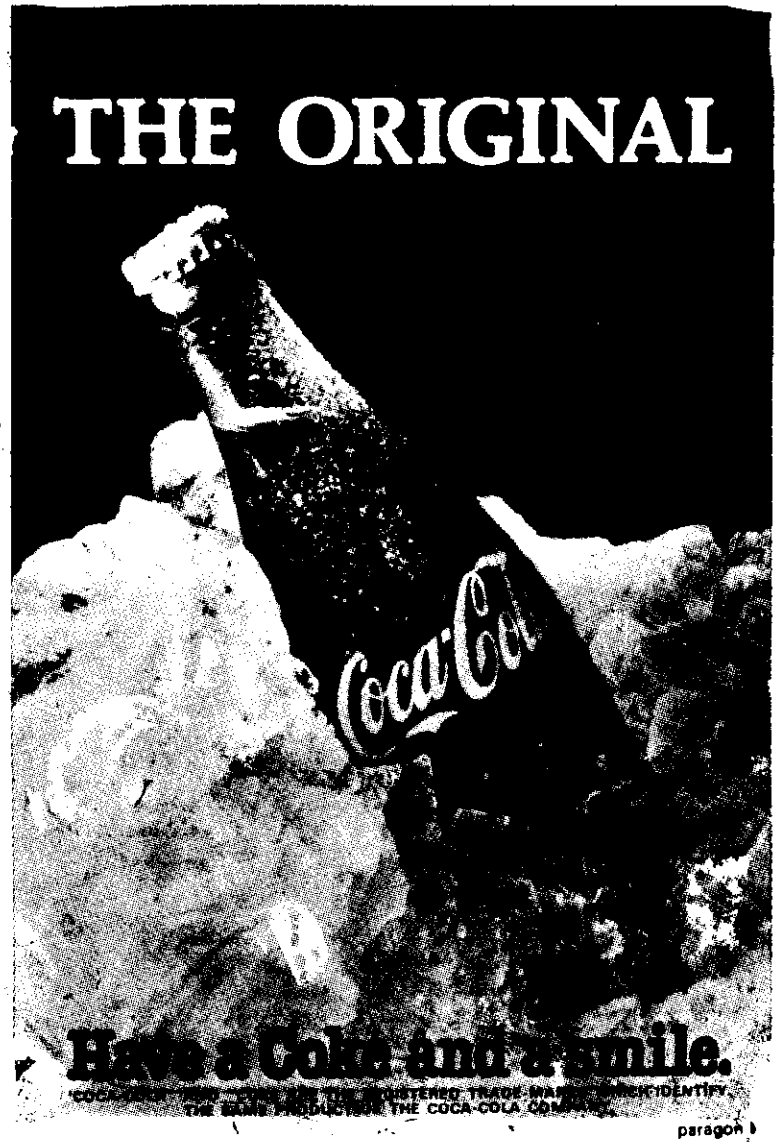
THE ORIGINAL
Have a Coke and a smile.
paragon

پاکستان کی کھلی فضاؤں میں

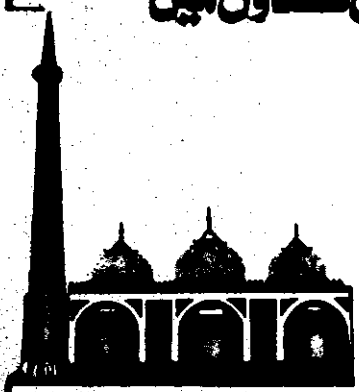

پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
عبادت، روحانی میراث
کی آئینہ دار ہے

اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے

ملی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرِ مبادلہ کما کر
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے

سروس شوز۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

SERVIS

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ

ایک اور اعزاز

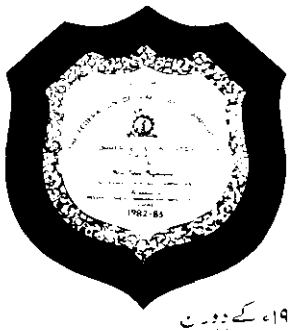

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے، ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمدکنندگان ہونے کا بجاطور پر شرف حاصل ہے۔

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمدکنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۔ شاہراہ قائداعظم، لاہور (پاکستان)

فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ ٹیلکس: 44543 NOOR PK

ایکسپورٹ آفس: ۶۱۹-۶۱۴ کامرس سینٹر، چوتھی منزل، حسرت موہانی روڈ، کراچی ۱ (پاکستان)

فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۳۳۱۷، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 33 | NOVEMBER 1984 | No. 11

قدرتی گیس کا ضیاع روکیئے

ہمارے توانائی کے وسائل محدود ہیں۔ ہم توانائی کے ضیاع کے متحمل نہیں ہو سکتے

گیس بچا کر
قومی معیشت کو
مستحکم بنائیے

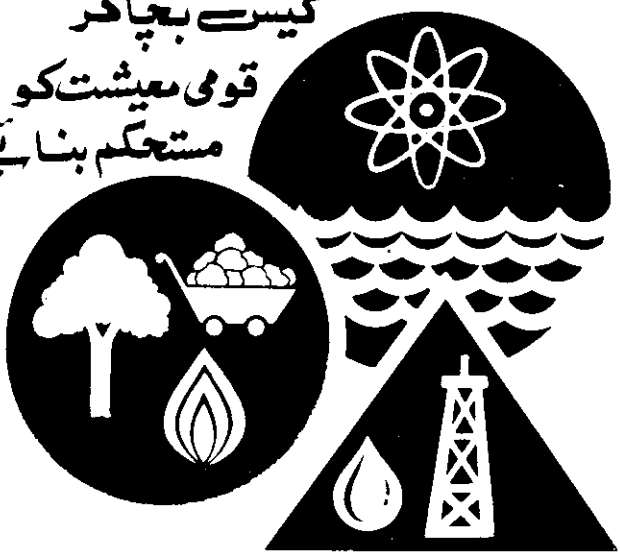

ہمارے ملک میں توانائی کے وسائل کی کمی ہے۔ توانائی کی ضروریات کثیر زرمبادلہ صرف کر کے پوری کی جاتی ہیں۔ ہماری صنعت، تجارت، زراعت کے شعبوں میں توانائی کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کی بچائی ہوئی توانائی ان اہم شعبوں کے فروغ میں کام آئے گی۔

قدرتی گیس بہت زیادہ قیمتی ہے
اسے ضائع نہ کیجئے

سوئی ناردرن گیس پائپ لائنز لمیٹڈ

SUI NORTHERN

SNGPL 4/60

paragon